وطن کی زینت

میاں ساجد علی

اقبال اکادمی پاکستان

اس کتاب کی اشاعت قومی ورثہ و ثقافت ڈویژن کے خصوصی مالی تعاون سے ہوئی

جملہ حقوق محفوظ

ناشر

ڈاکٹر عبد الرؤف رفیقی

ناظم

اقبال اکادمی پاکستان

حکومت پاکستان

قومی ورثہ و ثقافت ڈویژن

چھٹی منزل، ایوانِ اقبال، ایجرٹن روڈ، لاہور
Tel: [+92-42] 36314510, 99203573
Fax: [+92-42] 36314496
Email: info@iap.gov.pk
Website: www.allamaiqbal.com
ISBN 978-969-416-619-3

طبع اوّل : ۲۰۲۵ء

تعداد : ۵۰۰

قیمت : ۳۶۰ روپے

مطبع : ملک سراج الدین اینڈ سنز، لاہور

محل فروخت: سروسز بلاک، گراؤنڈ فلور، ایوانِ اقبال، ایجرٹن روڈ، لاہور

فہرست

- آتے ہیں جو کام دوسروں کے ۵
- احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات ۹
- اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی ۱۳
- آزاد مجھ کو کر دے، او قید کرنے والے ۱۹
- دل کو لگتی ہے بات بکری کی ۲۳
- فاطمہ! تو آبروئے اُمتِ مرحوم ہے ۲۷
- ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے ۳۱
- ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا ۳۷
- ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا ۴۱
- میں راہ میں روشنی کروں گا ۴۵
- نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں ۴۹
- نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو ۵۳
- نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز ۵۷
- صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس ۶۱

آتے ہیں جو کام دوسروں کے

سبحان علی کے سکول میں سیلاب زدگان کے لیے سامان اکٹھا کیا جارہا تھا اور تمام اساتذہ اپنی اپنی جماعتوں میں یہ اعلان کر رہے تھے کہ ہم سب کو اُن لوگوں کی مدد کرنی چاہیے جو اس وقت سیلاب کی تباہ کاریوں کا شکار ہیں۔ سکول کے میدان میں ایک جگہ کچھ اساتذہ اور طلبا ایک کیمپ قائم کیے ہوئے تھے جہاں پر مختلف اشیا جمع کی جارہی تھیں۔

سبحان نے آگے بڑھ کر ایک طالب علم سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ ہم یہ اشیا اِس لیے جمع کر رہے ہیں تاکہ اُن لوگوں تک پہنچائی جاسکیں جن کا سب کچھ سیلاب میں بہ چکا ہے۔ اب وہ لوگ بے سروسامانی کی حالت میں ہیں۔ انسانیت کے ناطے اب ہم سب کا یہ فرض ہے کہ ہم لوگ اُن کی مدد کے لیے آگے بڑھیں۔ سبحان کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا اور وہاں سے اپنی جماعت میں چلا گیا۔ جماعت میں بھی بچے سیلاب کی تباہ کاریوں کا ہی ذکر کر رہے تھے۔

دوپہر کو وہ گھر آیا اور کچھ دیر بعد اُس نے ٹی وی چلایا۔ ٹی وی پر صرف اور صرف سیلاب سے متعلقہ خبریں ہی چل رہی تھیں۔ سبحان علی ٹی وی پر نگاہیں جمائے بیٹھا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ سیلاب سے کس قدر تباہی ہوئی ہے۔ لوگوں کے گھر اُجڑ گئے ہیں۔ کاروبار ختم ہو چکے ہیں۔ مال مویشی سب پانی کی نذر ہو چکے ہیں۔ کسی کی اولاد بے آسرا ہے تو کسی کو اپنے پیاروں کی تلاش ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔ حکومت اور لوگ اپنی مدد آپ کے تحت امدادی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ یہ رقت آمیز مناظر دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

شام کو اُس کے والد صاحب گھر آئے تو اُنھوں نے کھانے کے دوران بتایا کہ آج اُنھوں نے گھر آتے ہوئے مختلف جگہوں پر امدادی کیمپ دیکھے ہیں اور لوگ بڑھ چڑھ کر سیلاب

زدگان کی مدد کے لیے کام کر رہے ہیں۔ سبحان جس گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اُس کو والد صاحب کی بات سن کر بولنے کا موقع مل گیا۔

اُس نے فوراً کہا کہ ہمارے سکول میں بھی ایک امدادی کیمپ قائم ہوا ہے جہاں اساتذہ اور بچوں نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق چیزیں جمع کرائی ہیں۔ اُس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد مزید کہا کہ میں بھی اس نیک کام میں حصہ لینا چاہتا ہوں۔

اُس کے والد گرامی اُس کے جواب پر خوش ہوئے اور اُسے کہا کہ حصہ تو سب لے رہے ہیں اور یہ اچھی بات ہے۔ تم ایک کام کرو کہ اپنے محلے میں اپنے دوستوں کو اکٹھا کرو اور اُنھیں بھی اس کارِ خیر میں حصہ ڈالنے کی ترغیب دلاؤ۔

سبحان بولا کہ میرے تمام دوست اس بات سے واقف ہیں کہ اُنھیں اس وقت سیلاب میں پھنسے لوگوں کی مدد کرنی ہے۔

اُس کے والد نے اُسے بتایا کہ وہ تو ٹھیک ہے اب اُسے اس سے بڑھ کر کام کرنا ہے۔

اُنھوں نے اُسے بتایا کہ وہ اپنے تمام دوستوں کو اکٹھا کرے اور سب کو اس نیک کام میں اس طرح حصہ لینا چاہیے کہ اُن کے گھروں میں جو کپڑے اُن کی ضرورت سے زیادہ ہیں، جو خوردنی اشیاء اُن کے پاس اپنے ماہانہ استعمال سے زیادہ ہیں۔ اُن سب کو ایک جگہ جمع کریں۔ اس کے بعد وہ سب دوست مل کر محلے کے دوسرے گھروں میں جائیں وہاں سیلاب زدگان کی مدد کے لیے چندہ کی اپیل کریں اور جب اُن کے پاس پیسے جمع ہو جائیں تو اُس سے وہ سیلاب میں ڈوبے لوگوں کے لیے کھانے پینے کی اشیا، دوائیاں اور کچھ دوسرا سامان خریدیں اور یہ تمام سامان اکٹھا کر کے کسی ایسی تنظیم یا ادارے کے پاس جمع کرائیں جن کی ٹیمیں سیلاب زدہ علاقوں میں یہ چیزیں پہنچا رہی ہیں۔ اس طرح محلے کے سب لوگ نیک کام میں اپنا حصہ بھی ڈال لیں گے اور اُن مجبور و بے کس لوگوں کی مدد بھی ہو جائے گی۔ جس سے اللہ بھی خوش ہو گا۔ یہی تعلیم ہمارے نبی کریم ﷺ نے ہمیں دی ہے کہ ہم غریبوں اور مفلس لوگوں کی مدد کریں۔ اب ایسا وقت ہم پر آن پڑا ہے جس پر ہمیں ثابت قدم رہتے ہوئے ایک قوم بننا ہے۔ ہم سب مسلمان ہیں اور پاکستانی ہیں۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم سب مل کر اپنے بھائیوں کی مدد

کریں تا کہ وہ دوبارہ سے اپنی زندگی کو خوشگوار بنا سکیں۔ ہم سب کو اپنے حصہ کی شمع روشن کرنی ہے اور جب ہم سب مل کر کام کریں گے تو اُس کام میں اللہ برکت بھی دے گا اور خوش بھی ہو گا۔ کسی کو مصیبت میں دیکھ کر اور اپنی استطاعت کے باوجود مدد نہ کرنا بہت بُری بات ہے، جس سے اللہ ناراض ہوتا ہے۔ جب ہم نیک کام کرتے ہیں تو ہمیں روحانی خوشی نصیب ہوتی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ جب تم اس نیک کام کے لیے اپنی کمر کس لو گے تو دیکھنا کہ تمھیں کس قدر کامیابی ملے گی۔

سبحان کی والدہ اس ساری گفتگو کو سن رہی تھی انھوں نے کہا کہ میرے پاس کچھ ایسے کپڑے ہیں جو ہم اُن کی مدد کے لیے دے سکتے ہیں میں تمھارے اس نیک کام میں اُن کپڑوں کے ذریعے حصہ ڈالتی ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ چادریں اور کمبل بھی تم اُن لوگوں کے لیے مجھ سے لے لو۔

والد صاحب نے اُس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا کہ ہم ایک دو روز میں جب گھر کا راشن خریدیں گے تو میں تمھیں کچھ خوردنی اشیا بھی خرید دوں گا جن کی اُن لوگوں کو ضرورت ہے مثلاً دالیں، مصالحہ جات، چائے، پانی کی بوتلیں وغیرہ۔

اپنے والدین کی باتیں سن کر اُس کا چہرہ کھل اُٹھا جیسے اُسے اپنا مقصد پورا ہوتا نظر آرہا ہو۔

اُس نے کہا کہ میں کل ہی اس مہم کو شروع کرتا ہوں اور اپنے دوستوں اور محلے داروں کو اس کام میں شامل کرتا ہوں۔

اگلے روز اُس نے اپنے تمام دوستوں کو اکٹھا کیا اور محلے داروں سے ملاقات کی۔ تمام لوگوں نے اُس کے اس جذبے کو سراہا۔ اُس کے ایک محلے دار نے جن کا گھر بڑا تھا، اپنے گھر کا ایک بڑا کمرہ ان اشیا کے لیے مختص کر دیا۔ اب تمام بچے محلے کے گھروں میں جاتے اور جہاں سے جو چیز ملتی وہ اُس کمرے میں لا کر رکھ دیتے۔ چند دنوں میں اُنھوں نے اتنی اشیا جمع کر لیں کہ پورا کمرا بھر گیا۔ اُن کے پاس نہ صرف اشیا کا ذخیرہ ہو گیا بلکہ کچھ نقدی بھی جمع ہو گئی۔ چھٹی والے دن سب محلے دار جمع ہوئے اُن میں سبحان علی بھی اپنے دوستوں کے ساتھ شامل تھا۔

سب نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور تمام سامان ایک تنظیم کے حوالے کیا۔ جنھوں نے اُن سب کا شکریہ ادا کیا اور سامان کو مستحق لوگوں تک پہنچانے کا وعدہ کیا۔

بچوں آپ نے دیکھا کہ سبحان علی سیلاب زدگان کے لیے بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوا۔ جس نے یہ نہیں سوچا کہ وہ یہ کام کیسے سرانجام دے سکتا ہے۔ بلکہ اُس نے اپنی لگن اور والد کی بتائی ہوئی بہترین حکمتِ عملی سے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا۔ ہم سب کو بھی چاہیے کہ ہم بھی اُس کی طرح نیک کام میں حصہ لیں۔ دوسروں کے کام آنے والے لوگ ہی اچھے ہوتے ہیں۔ سب اُن کی عزت کرتے ہیں اور ہمارے مذہب کی تعلیمات بھی ہمیں یہی درس دیتی ہیں کہ ہم غریبوں کی مدد کریں۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

سہانی شام تھی اور خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ محلے کے باغ میں بچوں کا شور برپا تھا، ہر کوئی کھیل کود میں مصروف تھا۔ جواد صاحب شام کی چہل قدمی کرتے کرتے باغ کی جانب مڑے اور کچھ دیر آرام کی غرض سے باغ میں بیٹھ گئے۔ وہ باغ میں بیٹھے بچوں کو کھیلتا ہوا دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ بچوں کے لیے ایسی سرگرمیاں انتہائی ضروری ہیں جن میں وہ اپنے جسم کو حرکت دیں، پھر اس طرح گھل مل کر کھیلنا بھی اچھا ہے کیونکہ اس سے سماجی رابطے بڑھتے ہیں۔ جواد صاحب اس ساری صورتِ حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ کچھ دیر باغ میں ستانے کے بعد وہ اُٹھے اور گھر کی جانب چل دیے۔ اُن کے ذہن میں کچھ باتیں اور سوالات جنم لے رہے تھے۔

جواد صاحب جب گھر پہنچے تو اپنے دونوں بچوں اکبر اور اصغر کو اپنے اپنے موبائل فون میں مصروف پایا۔ دونوں بھائی موبائل میں اس قدر مصروف تھے کہ اُنھیں یہ خبر ہی نہیں تھی کہ اُن کے والد اُن کے پاس موجود ہیں۔ کچھ دیر تک تو جواد صاحب یہ سارا منظر دیکھتے رہے۔ جواد صاحب کچھ دنوں سے محسوس کر رہے تھے کہ اُن کے بچے موبائل فون کی وجہ سے اپنے دوسرے کاموں کی جانب توجہ نہیں دے رہے تھے
جو کسی بھی طرح سے بچوں کے لیے موزوں نہیں۔

ایک روز جواد صاحب نے اپنے دونوں بچوں کو اپنے پاس بلایا اور اُنھیں پیار سے سمجھایا کہ بچوں موبائل فون کا زیادہ استعمال اچھا نہیں ہے۔ میں کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ دونوں سکول سے آکر موبائل میں اس قدر کھو جاتے ہو کہ آپ کو کوئی دوسرا کام سوجھتا نہیں ہے۔ نہ تو آپ کی توجہ سکول سے آنے کے بعد اپنی پڑھائی میں ہے، نہ نماز میں اور نہ ہی کسی دوسری سرگرمی میں۔ یہ بات انتہائی غیر موزوں ہے کہ آپ صرف موبائل کا استعمال کریں

اور دوسری تمام باتوں اور اخلاقی اقدار کو بھول جائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موبائل فون کے استعمال سے ہماری زندگی بہت آسان ہوئی ہے لیکن اس کے بے جا استعمال سے ہم نے اپنی بہت سے اقدار کو کھوڈالا ہے۔ ہم لوگ اخلاقی و تہذیبی طور پر بہت پیچھے چلے گئے ہیں۔

میں کچھ دنوں سے نوٹ کر رہا ہوں کہ آپ دونوں بھی موبائل کے بے جا استعمال میں اس قدر کھو گئے ہیں کہ آپ نہ تو اپنی پڑھائی پر توجہ دے رہے ہو نہ ہی نماز میں اور نہ ہی کسی دوسرے کام میں۔ آپ دونوں گھر میں ہوتے ہوئے بھی گھر میں موجود نہیں ہوتے۔ پہلے آپ دونوں شام کو باہر کھیلنے بھی جاتے تھے اور نماز کے لیے مسجد بھی جاتے تھے۔ لیکن اب موبائل کی وجہ سے آپ نے اپنی یہ دونوں سرگرمیاں بھی ترک کر دی ہیں۔ دیکھو بچو! موبائل آپ کی جائز ضرورت کے لیے ہی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آپ صرف اسی کے ہی ہو کر رہ جائیں۔ سائنسی ایجادات نے جہاں ہمارے لیے آسانیاں پیدا کی ہیں وہیں ہم نے کچھ ایسے نقصانات کا سامنا کیا ہے جن سے ہم نے اپنی اخلاقی اور مذہبی اقدار کو کھو دیا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ جس طرح دوسرے بچے باغ میں جا کر شام کو کھیلتے ہیں آپ ویسا نہیں کرتے۔ آپ دونوں شام کو گھر میں ہی رہتے ہیں اور موبائل میں کھو جاتے ہیں۔ شام کو جب آپ باہر جائیں گے تو آپ کو خوشگوار ہوا کا احساس ہو گا جو ہماری صحت کے لیے انتہائی ضروری ہے پھر جب آپ دوسرے بچوں سے ملیں گے اور اُن کے ساتھ کھیلیں گے تو آپ کے اُن سے سماجی رابطے بڑھیں گے۔ آپ کو دوسرے بچوں کے احساسات کا اندازہ ہو گا۔ اسی طرح جب آپ مسجد میں نماز پڑھنے جاؤ گے تو آپ کا رُجحان خود بخود اسلام کی جانب ہو گا۔ جیسے آپ موبائل میں ایک سٹیج سے دوسری سٹیج کی طرف بڑھتے ہو تو آپ کو نمبر ملتے ہیں۔

بچو! اسی طرح جب ہم عملی زندگی میں بھی اچھے کام کرتے ہیں تو ہمارے نیک اعمال کی وجہ سے ہمیں ثواب ملتا ہے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ موبائل کے بے جا استعمال سے نہ صرف آپ کی پڑھائی متاثر ہو رہی ہے بلکہ آپ نمازوں کو چھوڑ کر اپنی نیکیاں بھی ضائع کر رہے ہیں۔ اس لیے موبائل پر اپنا وقت کم سے کم لگاؤ اور اپنے دوسرے کاموں پر توجہ زیادہ رکھو۔

اگر آپ اسی طرح موبائل کا استعمال کرتے رہے تو آپ اپنی جماعت میں باقی طلبا سے بھی پیچھے رہ جاؤ گے۔

دونوں بچے اپنے والد کی باتوں کو غور سے سن رہے تھے اور اُنھیں احساس تھا کہ وہ موبائل فون کے بے جا استعمال سے کیا کچھ کھو رہے ہیں۔ دونوں بچوں نے اپنے والد سے وعدہ کیا کہ وہ موبائل کے استعمال کو کم سے کم کریں گے اور اپنی بھرپور توجہ اپنی پڑھائی اور دوسرے کاموں میں صرف کریں گے۔

پیارے بچو! جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ جواد صاحب نے اپنے دونوں بچوں کو موبائل کے بے جا استعمال سے منع فرمایا ہے اسی طرح ہم سب کو بھی چاہیے کہ ہم موبائل کو ضرورت کے وقت ہی استعمال کریں۔ کیونکہ اس کے زیادہ استعمال سے ہم اپنے دوسرے کاموں پر توجہ نہیں دے پاتے۔ آپ بچے پاکستان کا مستقبل ہیں آپ نے ہی بڑے ہو کر اس ملک کی ترقی میں اپنا حصہ ڈالنا ہے۔ اس لیے آپ کی زیادہ تر توجہ اپنی پڑھائی اور اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے میں صرف ہونی چاہیے۔ ہمارے قومی شاعر علامہ اقبال نے بھی آپ بچوں کو شاہین سے تشبیہ دی تھی اور وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ میری قوم کے بچے دُنیا کے جدید علوم سیکھیں اور قرآن سے اپنا رشتہ جوڑتے ہوئے آگے بڑھیں تاکہ دُنیا میں مسلمان عزت کی نگاہ سے دیکھے جائیں۔ موبائل کے بے جا استعمال اور اُس میں کھیلی جانے والی گیمز سے زیادہ تر بچے ذہنی اور نفسیاتی اثر لیتے ہیں اور اُن میں خوف اور ڈر پیدا ہوتا ہے جس سے اُن کی صحت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس لیے موبائل فون اور ایسی تمام چیزوں کے زیادہ استعمال سے ہمیں اجتناب کرنا چاہیے جن سے ہماری شخصیت متاثر ہوتی ہے۔ ایک اچھے انسان کی خوبی یہی ہوتی ہے کہ وہ تمام سرگرمیوں پر اپنا وقت یکساں صرف کرتا ہے۔ اس لیے آپ تمام بچوں کو نصیحت ہے کہ آپ سب سے پہلے اپنی پڑھائی پر توجہ دیں، نمازیں پڑھیں اور اپنے والدین و اساتذہ کا احترام کریں۔

اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

محمد علی نے اپنے گھر میں ایک پنجرے میں کچھ چڑیاں پال رکھی تھیں۔ جن کی دیکھ بھال وہ خود کرتا تھا، کبھی کبھی اُس کا چھوٹا بھائی احمد علی بھی چڑیوں کو پانی اور باجرہ ڈال دیتا تھا۔ دونوں بھائیوں کا یہ مشغلہ روز بروز پروان چڑھتا جا رہا تھا۔ اُن کی دادی اماں اُنھیں ایسا کرتا دیکھتی تو خوش ہوتی۔

صبح سویرے اور شام ڈھلتے چڑیاں پنجرے سے آوازیں لگاتیں جیسے وہ کہہ رہی ہوں کہ اُنھیں آزاد کر دیا جائے۔ لیکن دونوں بھائی چڑیوں کی آواز پر کان نہ دھرتے۔

ایک روز دادی اماں نے دونوں کو اپنے پاس بلایا اور اُن سے پوچھا کہ کیا تم دونوں جانتے ہو کہ یہ چڑیاں یوں آوازیں کیوں نکالتی ہیں؟

تو احمد علی فوراً بولا کہ وہ ہم سے خوش ہیں اور اس لیے آوازیں نکالتی ہیں جبکہ محمد علی کچھ سوچنے کے بعد بولا کہ شاید وہ ہم سے کچھ کہنا چاہتی ہیں لیکن کیا کہنا چاہتی ہیں یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔

آخر دادی اماں نے کہا کہ یہ بات تو تمھاری بالکل ٹھیک ہے کہ وہ کسی بات کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا اور سمجھنا چاہیے کہ وہ کس بات پر شور مچاتی ہیں؟

دادی اماں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان اور چرند پرند کو آزاد پیدا کیا ہے لیکن ہم نے ان چڑیوں کو اپنے پاس پنجرے میں قید کیا ہوا ہے جس سے آزادی اُن کا حق ہے۔

احمد علی بولا کہ اگر ہم نے اُنھیں آزاد کر دیا تو وہ اُڑ جائیں گی اور پھر ہمارے پاس دوبارہ کبھی نہیں آئیں گی۔

دادی اماں نے کہا کہ ایسا کرنے میں چڑیوں کی بھی بھلائی ہے اور آپ دونوں کو ثواب بھی ملے گا کہ آپ نے اُنھیں آزادی عطا کی ہے جس سے وہ اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق

گزار سکیں۔ دادی اماں نے اُن سے پوچھا کہ کیا آپ نے اپنی کتاب میں علامہ اقبال کی نظم ''پرندے کی فریاد'' نہیں پڑھی؟ تو دونوں بولے جی بالکل پڑھی ہے۔ تو دادی اماں نے کہا کہ اُس کے آخری شعر میں وہ قیدی پرندہ بھی تو یہی فریاد کرتا ہے کہ:

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دُعا لے!

محمد علی چونکہ بڑا تھا تو فوراً سمجھ گیا اور بولا کہ ہاں مجھے یاد آ گیا۔ ہمارے اُستاد صاحب نے بھی اس نظم کے بارے میں ہمیں ایک کہانی کی طرح بتایا تھا کہ پرندوں کو قید نہیں کرنا چاہیے۔

دادی اماں نے انھیں بتایا کہ اگر وہ چڑیوں کو آزاد کر دیں گے تو وہ اُن سے خوش ہوں گی اور انھیں دُعائیں دیں گی۔

احمد علی بولا کہ وہ چند دن ابھی ان چڑیوں کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے تاکہ خوب دل بہلا لے۔

محمد علی ایک دم بولا کہ دادی اماں آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ہم ان چڑیوں کو ضرور آزاد کریں گے لیکن صرف چند بعد۔

دادی اماں نے پوچھا کہ چند دن بعد ہی کیوں؟

محمد علی نے اُنھیں بتایا کہ میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے کہ کچھ دنوں بعد ۱۴ اگست ہو گی جو ہماری آزادی کا دن ہے تو ہم اُسی روز ان چڑیوں کو بھی آزاد کر دیں گے۔

احمد علی نے بھی کہا: ہاں یہ ٹھیک ہے۔

دادی اماں نے بھی ان کی اس تجویز کو مان لیا۔ اب دونوں بچے روز چڑیوں کو پہلے سے زیادہ وقت دیتے اور اُن کے کھانے پینے کے لیے بھی پہلے سے زیادہ انتظام کرتے۔ آخر کار یوں وقت گزرتا گیا اور ۱۴ اگست کا سورج طلوع ہوا۔ دونوں بچے ہاتھ میں پاکستان کے پرچم کی جھنڈیاں لیے پنجرے کے پاس پہنچ گئے دادی اماں وہاں پہلے سے موجود تھیں۔ اُنھوں نے پنجرے کا تالا کھولا اور چڑیوں کے باہر نکلنے کا راستہ بنا دیا۔ دونوں بچے پنجرے سے ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے اور چڑیاں خوشی سے شور مچاتی ہوئیں پنجرے سے باہر نکل گئیں۔ دونوں بچے چڑیوں کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے جو کبھی کسی چیز پر بیٹھتیں اور کبھی ہوا میں چکر

لگا تیں۔ جیسے وہ ان تینوں کا شکریہ ادا کر رہی ہوں۔ کچھ دیر تک یہ نظارہ دیکھنے کے بعد چڑیاں فضا میں چلی گئیں۔ اب وہ آزاد تھیں۔ اپنی مرضی سے آسمان میں بلند ہوتیں۔

دادی اماں نے بچوں کو کہا کہ دیکھا بچو! کہ آزادی کتنی بڑی نعمت ہے۔ جو چڑیاں آپ کے پاس قید تھیں وہ اپنی آزادی کا مطالبہ اس لیے کر رہی تھیں کہ اُنھیں بھی باقی پرندوں کی طرح گھومنے پھرنے اور اُڑنے کی آزادی ہو۔ آزادی ہر جاندار کا بنیادی حق ہے۔ آج ۱۴ اگست کا دن بھی ہم سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ ہم آزاد ہیں اور اپنی آزادی کی حفاظت کریں گے۔

محمد علی نے کہا کہ دادی اماں ہمیں کچھ پاکستان کی آزادی کے بارے میں بھی بتائیں کہ یہ ملک کیوں آزاد ہوا؟

دادی اماں نے بتایا کہ ایک ہزار سال کی داستان ہے جس کا نچوڑ یہ ہے کہ ہندوستان میں دو قومیں آباد تھیں جن کی اکثریت تھی۔ ایک ہندو اور دوسرے مسلمان۔ جب ہندوؤں نے مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے شروع کیے اور اُنھیں بے جا تنگ کرنا شروع کیا تو مسلمان رہنماؤں نے ہندوؤں کی ان حرکتوں سے تنگ آ کر سیاسی طور پر ایک آزاد اسلامی ریاست کا مطالبہ کر دیا۔ یہ مطالبہ آہستہ آہستہ زور پکڑ گیا اور مسلمانوں کو بھی سمجھ آ گئی کہ اب ہمارا گزارا ہندوؤں کے ساتھ ناممکن ہے۔ یہ چیز دو قومی نظریہ کی بنیاد بنی۔

احمد علی نے بتایا کہ میں نے کتاب میں پڑھا تھا کہ دو قومی نظریے سے یہ مراد ہے کہ برصغیر میں دو قومیں آباد ہیں ہندو اور مسلمان۔

دادی اماں نے کہا: ہاں اور اُن دونوں کے مذہب، ثقافت، تاریخ، ادب اور رسوم میں بھی فرق تھا تو یہ دونوں اکٹھا کیسے رہ سکتی تھیں۔ اس لیے مسلمان قوم کا مطالبہ زور پکڑ گیا اور اُنھوں نے سیاسی طور پر ایک آزاد اسلامی ریاست کے لیے جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ اس ضمن میں پہلے پہل دسمبر ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا اور پھر علامہ اقبال نے اپنے صدارتی خطبہ میں ایک آزاد ریاست کا خواب مسلمانوں کو دکھا دیا۔ یہ خطبہ ''خطبہ الٰہ آباد'' کہلاتا ہے جو ۱۹۳۰ء میں دیا گیا تھا۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۴۰ء میں قائداعظم محمد علی

جناح کی قیادت میں لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں ''قراردادِ لاہور'' منظور ہوئی جسے بعد ازاں ''قراردادِ پاکستان'' کا نام دیا گیا۔ ہندوستان بھر کے مسلمان قائداعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت میں مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے ۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب پاکستان دُنیا کے نقشہ پر ایک آزاد اسلامی ریاست کے طور پر اُبھرا۔

دادی اماں نے انھیں مزید بتایا کہ پاکستان کے قیام سے قبل ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کی مثال اُن چڑیوں جیسی تھی جنھیں آپ نے اپنے پنجرے میں قید کیا ہوا تھا۔ جیسے چڑیاں اپنی آزادی کا مطالبہ کر رہی تھیں اسی طرح مسلمانانِ ہند نے بھی آزاد اسلامی ریاست کے لیے کوششیں کیں۔ کیونکہ ہندوستان میں اُنھیں بالکل بھی مذہبی آزادی حاصل نہیں تھی۔ وہ جب بھی اپنی مذہبی رسوم ادا کرنا چاہتے یا اپنے مذہبی فرائض انجام دینا چاہتے تو ہندوؤں کی طرف سے انھیں رکاوٹوں کا سامنا تھا اس لیے مسلم رہنماؤں نے انھیں وہ رستہ دکھایا جس پر عمل پیرا ہو کر وہ آزادی سے اپنے مذہب پر عمل کر سکیں اور وہ راستہ ایک آزاد اسلامی ریاست کا تھا، جس کا نام ''پاکستان'' ہے۔ یہاں ہم آزاد ہیں۔ ہم اپنی مساجد میں آزادی سے آتے جاتے ہیں۔ ہم اپنے مذہبی ایام کو آزادی سے مناتے ہیں۔ ہمارے بڑوں نے یہ ملک صرف اسی لیے بنایا تھا کہ اسلامی اُصولوں کے مطابق ہم اپنی زندگیاں یہاں آسانی کے ساتھ گزار سکیں۔ جیسا کہ آپ نے اب اُن چڑیوں کو آزاد کر دیا ہے تو آپ نے دیکھا کہ اُنھوں نے کس طرح آزادی پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اب وہ چڑیاں آزاد ہیں اور جہاں چاہیں اور جیسے چاہیں اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزار سکتی ہیں۔ اسی طرح پاکستان کے قائم ہونے سے یہاں رہنے والے مسلمان اپنی زندگی اپنی مذہبی آزادی کے مطابق بآسانی گزار سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم پاکستان سے پیار کریں اور اس کی آزادی کی حفاظت کریں۔ ہمارے بزرگوں نے اس ملک کو بہت مشکل سے حاصل کیا ہے اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی ترقی کے لیے بھرپور محنت کریں۔ آپ بچوں کو بھی چاہیے کہ آپ خوب دل لگا کر پڑھیں اور محنت کریں۔ تاکہ آپ ایک اچھے انسان بن کر اس کی نہ صرف خدمت کریں

بلکہ آنے والی نسلوں کی بھی تربیت کریں تاکہ ہمارا پیارا وطن دُنیا میں باعزت ممالک کی فہرست میں کھڑا ہو۔

دونوں بچوں نے دادی اماں سے وعدہ کیا کہ وہ اب کسی پرندے کو اس طرح قید نہیں کریں گے اور محنت اور لگن سے اپنی پڑھائی مکمل کر کے پاکستان کی ترقی میں اپنی خدمات پیش کریں گے۔

آزاد مجھ کو کر دے، او قید کرنے والے

احتشام کو فرصت میں مطالعے کا شوق تھا۔ ایک روز اُس نے علامہ اقبال کی کتاب بانگِ درا پکڑی تو اُس میں موجود بچوں کی نظموں کا مطالعہ کرنے لگا۔ اُسے یہ نظمیں بہت پسند تھیں، اِس لیے اکثر وہ اِن کو پڑھتا تھا۔ جس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ سکول میں اکثر یہ نظمیں اُسے مختلف مواقع پر سننے کو ملتی تھیں اور کچھ نظمیں تو وہ اپنی پچھلی جماعتوں میں پڑھ بھی چکا تھا کیونکہ وہ نصاب کا حصہ تھیں۔ اس لیے اِن نظموں سے رغبت فطری بات تھی۔ ایسی ہی ایک نظم 'پرندے کی فریاد' اُس نے پڑھنا شروع کی اور ساتھ ساتھ گنگناتا رہا۔ وہ اپنے اِس عمل میں اِس قدر محو تھا کہ اُسے ارد گرد کی کچھ خبر نہ تھی۔ اُس کی آواز بلند سے بلند تر ہو رہی تھی اور اُس کے کمرے سے باہر جا رہی تھی۔

اُس کے ابا جان اُس کی اِس حرکت پر مسکرا رہے تھے۔ جب نظم ختم ہوئی تو کچھ دیر بعد وہ اپنے کمرے سے باہر آیا تو ابا جان نے پوچھا کہ بھئی تم تو بہت اچھا گنگنا لیتے ہو۔

وہ کچھ حیران سا ہوا کہ اُن کو کیسے خبر ہوئی؟ ابھی وہ اسی تذبذب میں تھا کہ ابا جان کو کیسے پتہ چلا؟

تو اتنے میں اُس کے ابا جان نے بتایا کہ تم علامہ اقبال کی نظم کو اونچی آواز میں گنگنا رہے تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا: جی مجھے یہ نظم بہت پسند ہے۔

ابا جان نے اُس سے پوچھا کہ کیا تمھیں اس نظم میں موجود پیغام کے بارے میں آشنائی ہے تو وہ بولا کہ ایک پرندہ جو قید ہو گیا ہے وہ اپنی آزادی کے لیے فریاد کرتا ہے۔

ابا جان مسکرائے اور بولے کہ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ پرندہ اپنی آزادی کے لیے فریاد کر رہا ہے۔ لیکن جو بات میں تمھیں سمجھانا چاہتا ہوں وہ تھوڑی سی مختلف ہے۔

اب احتشام کا تجسس بڑھنے لگا کہ اس نظم میں اور کون سی ایسی بات ہے جو مجھے معلوم نہیں اور ابا جان اُس کو سمجھانا چاہتے ہیں۔

اُس نے اپنی نگاہیں اُن پر مرکوز کر دیں اور بڑے ادب سے اُن کے پاس بیٹھ گیا۔

ابا جان نے کہا کہ دیکھو جب کوئی شاعر شاعری کرتا ہے تو بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں جنھیں وہ براہِ راست نہیں کہتا بلکہ ایسا کرنے کے لیے وہ استعارات اور تشبیہات کا استعمال کرتا ہے۔ یہاں اِس نظم میں شاعر مشرق نے بھی کچھ ایسا ہی کیا ہے کہ بظاہر تو ہمیں اس نظم کو پڑھ کر یہ لگتا ہے کہ یہ نظم ایک پرندے کی فریاد ہے جو قید ہو چکا ہے اب اپنی آزادی چاہتا ہے۔ لیکن علامہ اقبال اس نظم میں جو پیغام دے رہے ہیں اُسے سمجھنے کی اشد ضرورت ہے۔ اب میں تمھیں بتاتا ہوں کہ نظم میں جس پرندے کا ذکر ہے وہ مسلمان قوم ہے۔ جس نے ہندوستان پر کئی صدیوں تک حکومت کی تھی۔ اس لیے وہ قوم نظم کے آغاز میں اپنے عہدِ رفتہ کو یاد کرتی ہے کہ اُسے یہاں ہر طرح کی آزادی تھی۔ پرندے کی زبان سے علامہ اقبال نے مسلمانوں کے اُس سنہری دور کی یاد دلائی ہے جس میں انھوں نے حکمرانی کی تھی۔ پھر اِسی نظم میں پرندے نے جو اپنی قید کا ذکر کیا ہے وہ مسلمانوں کا وہ دور ہے جب اُن کی حکمرانی یہاں نہیں رہی تھی۔ ہندوستان میں ہی وہ انگریزوں کے غلام بن گئے تھے۔ غلامی میں رہتے ہوئے کوئی بھی قوم اپنی خود مختاری اور خودداری کو کھو دیتی ہے۔ مسلمان قوم کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا کہ وہ اُس ملک میں غلامی اور پستی کی زندگی گزار رہے تھے جہاں کبھی وہ حکمران تھے۔ علامہ اقبال نے اشاروں میں یہ بات کی تھی کہ جیسے ایک پرندہ آزاد فضا میں اُڑتا ہے اور وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے آتا جاتا ہے اور چہچہاتا ہے لیکن جب اُسے قید کر دیا جائے تو اُس کی وہ آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے ایک پنجرے میں اگر کسی پرندے کو قید کیا جائے تو وہ پرندہ صرف اُس پنجرہ میں ہی اُڑ سکتا ہے۔ پنجرے میں اُس کو وہ آزادی کو نہیں مل سکتی جو پنجرے سے باہر میسر آتی ہے۔ قید میں تو اُس کو خوراک بھی اُس مالک کی مرضی سے ملتی ہے جس نے اُسے قید کیا ہوتا ہے۔ جبکہ آزاد فضا میں وہ جہاں سے چاہے کھائے پیئے۔ اس لیے علامہ اقبال اِس نظم میں مسلمانوں کی منظر کشی کرتے ہیں کہ وہ ایک غلام قوم ہیں اور اِس

غلامی نے اُن کی صلاحیتوں کو منجمد کر دیا ہے، جس کی بدولت وہ ذلت و پستی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس لیے وہ آزادی کے لیے مطالبہ کرتے ہیں کہ انھیں آزاد کیا جائے تاکہ وہ اپنی خواہش اور آزادی کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔ یہ آزادی مذہب کی آزادی تھی تاکہ وہ اسلام کے اُصولوں کے مطابق زندگی گزاریں۔ کیونکہ ایک غلام قوم کی وجہ سے ہندوستان میں اُن کو مذہبی آزادی بالکل بھی حاصل نہیں تھی۔ علامہ اقبال نے چونکہ پاکستان یعنی ایک آزاد اسلامی ریاست کا خواب دیکھا تھا اس لیے وہ چاہتے تھے کہ مسلمان ایک آزاد قوم ہیں اور ان کے لیے ایک الگ آزاد اسلامی ملک کا ہونا اشد ضروری ہے۔ اس لیے آپ کو مفکر پاکستان بھی کہا جاتا ہے۔ اس لیے آپ نے اس نظم میں پرندے کی زبان سے آزادی کا مطالبہ کروایا ہے۔ یہ دراصل مسلمانوں کی آزاد اسلامی ریاست کا مطالبہ تھا جس میں مسلمان قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں کامیاب ہوئے تھے۔ آج ہم پاکستان میں آزاد زندگی گزار رہے ہیں اور ہمیں اسلامی اُصولوں پر عمل پیرا ہونے میں کسی قسم کی کوئی دشواری نہیں ہے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح اِس نظم میں پرندے نے اپنی آزادی کا ذکر کیا تھا۔ ہمیں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرنی چاہیے کہ وہ آزادی کی اِس نعمت کو ہمیشہ ہمارے لیے باعثِ برکت بنائے اور مسلمان اِس کی قدر و منزلت کو سمجھیں اور اسلامی تعلیمات اور اُصولوں کے مطابق اپنی زندگی کو گزاریں تاکہ ہم وہ مقصد حاصل کریں جس کے لیے اُس وقت کے مسلمانوں نے آزاد اسلامی ریاست کے لیے جدوجہد کی تھی۔

احتشام نے والد صاحب کا شکریہ ادا کیا، اُس کے چہرے پر ایک عجیب سی خوشی عیاں تھی جیسے اُسے آزادی کا مطلب صحیح معنوں میں سمجھ آ گیا ہو۔

دل کو لگتی ہے بات بکری کی

سکول میں اعلان ہوا کہ یوم آزادیٔ پاکستان کو جوش و خروش سے منایا جائے گا اور تمام طلبا و طالبات ملّی نغمے، تقاریر اور سجاوٹ کے مقابلوں میں حصہ لیں۔ بچوں میں ان مقابلوں کا انعقاد وطن سے محبت کو اُجاگر کرنے کا ایک بہترین ذریعہ تھا۔ ہر بچے کی کوشش تھی کہ وہ کسی نہ کسی مقابلے میں حصہ لے اور انعام جیتے۔

سالار نے سوچا کہ وہ بھی ضرور حصہ لے گا کیونکہ اُس کو بھی پاکستان سے محبت تھی۔ اپنی اِس خواہش کو لیے وہ گھر آیا اور گھر میں اُس نے اپنے ابا جان کو بتایا کہ وہ سکول میں ہونے والی یومِ آزادی کی تقریب میں حصہ لینا چاہتا ہے۔ اُس کے ابا جان خوش ہوئے اور اُس سے پوچھا کہ وہ کس مقابلے کے لیے اپنے آپ کو مناسب سمجھتا ہے۔ اُس نے کہا کہ وہ تقریر کرنا چاہتا ہے۔

رات کو کھانے کے دوران نے اُس کے ابا جان نے اپنے بڑے بھائی یعنی سالار کے تایا ابو سے ذکر کیا کہ وہ سکول میں یومِ آزادی کی تقریب میں تقریری مقابلہ میں حصہ لینا چاہتا ہے۔ اُس کے تایا ابو نے کہا کہ یہ تو بہت اچھی بات ہے اور اِس طرح سالار کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع بھی مل جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ وہ خود اُسے تقریر کے لیے تیار کریں گے۔

اگلے روز شام کو سالار اپنے تایا ابو کے کمرے میں داخل ہوا اور اُنھیں سلام کر کے اُن کے پاس پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کے تایا ابو نے اُسے پاکستان کی آزادی کی تحریک کے بارے میں بتانا شروع کیا کہ ہندوستان میں جب انگریزوں کی حکومت آئی تو اُنھوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر اُن پر ظلم ڈھائے۔ مسلمانوں کو ہر اعتبار سے پیچھے کر دیا گیا۔ وہ تعلیم و تہذیب میں پسماندہ ہو گئے۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی کہ اُنھیں واپس اپنا

کھویا ہوا مقام حاصل ہو۔ ایسے میں سر سید احمد خاں نے اُنھیں تعلیم حاصل کرنے کی جانب راغب کیا اور اُنھیں یہ باور کرایا کہ اگر وہ آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو اُنھیں تعلیمی میدان میں آگے بڑھنا ہو گا۔ اس کے بعد جس شخصیت کا کردار سب سے اہم اور نمایاں تھا وہ علامہ اقبال تھے۔ جنھوں نے مذہبی بنیادوں پر اپنی قوم کی رہنمائی کی۔ اُنھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ باور کرایا کہ وہ ایک الگ قوم ہیں اور اُن کی اپنی پہچان مذہب سے ہے۔ مذہبی بنیادوں پر ہی قائم رہتے ہوئے وہ اپنی الگ شناخت بنا سکتے ہیں۔ علامہ اقبال نے الٰہ آباد کے مقام پر اپنے صدارتی خطبہ میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ اسلامی ریاست کا منظر پیش کیا اور پھر قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں برصغیر کے مسلمانوں نے ایک آزاد اسلامی ریاست کے حصول کو ممکن بنایا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ علامہ اقبال نے صرف الٰہ آباد میں ہی آزاد اسلامی ریاست کا خواب نہیں دیکھا تھا بلکہ وہ ابتدا سے ہی مسلمانوں کے لیے ایک علیٰحدہ وطن کے خواہاں تھے۔

سالار کے تایا ابو نے کہا کہ اب میں تمھاری توجہ علامہ اقبال کی اُس نظم پر دلانا چاہتا ہوں جو تمھارے نصاب میں شامل ہے۔

وہ ایک دم چونکا اور پھر بولا وہ نظم تو "ایک گائے اور بکری" ہے۔

تایا ابو نے کہا: "ہاں"۔ اُنھوں نے مزید کہا کہ کیا کبھی تم نے غور کیا ہے کہ یہ نظم ایک گائے اور ایک بکری کے درمیان مکالمہ ہے۔ اگر غور کرو تو گائے ہندوؤں کے مقدس جانور کے طور پر نظم میں موجود ہے اور بکری مسلمانوں کے لیے ہے۔ گائے کا تعلق ایک اکثریت سے ہے یعنی ہندوستان میں ہندو، جو کہ اکثریت میں تھے اور بکری کا تعلق ایک اقلیت سے ہے یعنی ہندوستان میں مسلمان۔ نظم کے آخر میں گائے اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ بکری کی ذات تو چھوٹی ہے لیکن اُس نے جو بات کی ہے یا جو مطالبہ وہ کر رہی ہے وہ ٹھیک ہے۔ یعنی اقلیت کا ایک مطالبہ ہے جو وہ اکثریت سے کر رہی ہے اور وہ مطالبہ درست ہونے کے ساتھ ساتھ اکثریت کو ماننا بھی پڑ رہا ہے۔ یعنی ایک الگ اسلامی ریاست کا وہ مطالبہ جو ہندوستان میں مسلمان کر رہے ہیں وہ درست ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی فکر کے ذریعے مسلمانوں کو یکجا کیا

اور اُن میں اپنی شاعری کے ذریعے سے رُوح پھونکی کہ الگ اسلامی ریاست کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ قائداعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت میں مسلمانوں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا اور یوں ایک آزاد اسلامی ریاست ''پاکستان'' کے نام سے معرضِ وجود میں آئی۔

پاکستان کا خواب چونکہ علامہ اقبال نے دیکھا تھا اس لیے ہم اُنھیں مصورِ پاکستان بھی کہتے ہیں۔ علامہ اقبال اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ ہندوستان میں دو بڑی قومیں یعنی ہندو اور مسلمان آباد ہیں۔ ان کے رسوم و رواج، مذہب، ثقافت، روایات میں فرق ہیں اس لیے یہ دونوں قومیں کبھی اکٹھی نہیں رہ سکتیں۔ اس لیے آپ نے شروع ہی سے ایک الگ وطن کا خواب دیکھا تھا، جہاں مسلمان اپنی مذہبی آزادی کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔

سالار نے کہا: کہ تایا ابو لیکن ہم ہندوؤں کے ساتھ رہ تو سکتے تھے اور رہ بھی رہے تھے تو پھر ایک الگ وطن کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

اُس کے تایا ابو نے اُسے بتایا کہ جب تک مسلمانوں کے پاس اقتدار تھا تو مسلمانوں کا سلوک ہندوؤں سے ہمیشہ اچھا رہا تھا لیکن ہندوؤں نے کبھی بھی مسلمانوں کو دل سے ایک الگ قوم تسلیم نہیں کیا تھا۔ جب مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں ختم ہوئی تو انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ بُرا سلوک شروع کر دیا اور اُن پر ترقی کے تمام دروازے بند کر دیئے۔ مجھے تمھارے سوال سے ایک واقعہ یاد آ گیا ہے تمھیں وہ بھی سنا دوں، جس سے مجھے اُمید ہے کہ تم میری بات بآسانی سمجھ جاؤ گے۔

سنو! ایک مرتبہ کسی تعلیمی ادارے میں قائداعظم محمد علی جناح کو مہمانِ خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ اُس تعلیمی ادارے میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے طلبا زیر تعلیم تھے۔ جب قائداعظم محمد علی جناح تقریر کے لیے سٹیج پر آئے تو ایک ہندو لڑکے نے اُن سے سوال کیا کہ مسٹر جناح آپ لوگ بھی ہمارے ہی طرح ہیں تو پھر آپ نے الگ ریاست کا مطالبہ کیوں کیا؟ قائداعظم محمد علی جناح اُس کا سوال سن کر کچھ مسکرائے اور اپنے پاس کھڑے لڑکوں سے کہا کہ مجھے ایک گلاس پانی کا دو۔ جب آپ کو گلاس پیش کیا گیا تو آپ نے اُس میں سے کچھ پانی پیا اور اُس ہندو لڑکے کو کہا کہ باقی پانی تم پی لو۔ اُس ہندو لڑکے نے

انکار کر دیا کہ آپ مسلمان ہیں اور ہم (ہندو) آپ کا پانی نہیں پی سکتے تو قائد اعظم محمد علی جناح نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے کچھ لڑکوں کی جانب گلاس بڑھایا اور اُنھیں پانی پینے کا کہا تو فوراً ایک لڑکا آگے بڑھا اور گلاس میں موجود باقی پانی پی گیا۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے اُس ہندو لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اس لیے ہم ایک الگ ریاست کا مطالبہ کرتے ہیں۔

سالار کو تو جیسے ساری بات سمجھ آ گئی ہو۔ وہ واہ واہ کرنے لگ گیا اور بولا کہ مجھے سمجھ آ گئی ہے کہ مسلمانوں نے ایک الگ ریاست کا مطالبہ کیوں کیا تھا۔ مسلمان بے شک اقلیت میں تھے لیکن اُن کا مذہب، اُن کے رسم و رواج، اُن کی روایات، اُن کی ثقافت، اُن کی تاریخ غرض یہ کہ ہر چیز ہی ہندوؤں سے الگ تھی اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ہندوستان میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر رہتے، اس لیے اُنھوں نے پاکستان بنایا تاکہ انھیں مکمل طور پر مذہبی آزادی حاصل ہو۔

تایا ابو نے اُسے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ تمھیں ساری بات سمجھ آ گئی ہے اور اب تمھیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کا مطالبہ غلط نہ تھا۔ اب پاکستان قائم ہو چکا ہے۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم پاکستان کی ترقی کے لیے دن رات محنت کریں اور جن مقاصد کے لیے ہم نے اس کا حصول ممکن بنایا تھا اُن کو حاصل کریں۔ آزاد قومیں اپنی آزادی کو انتہائی جوش و خروش سے مناتی ہیں، اس لیے تمھیں بھی چاہیے کہ تم اپنے سکول میں ہونے والی یومِ آزادی کی تقریب میں بھرپور شرکت کرو۔

فاطمہ! تو آبروئے اُمتِ مرحوم ہے

سکول میں اعلان کیا گیا کہ خواتین کے عالمی دن کے موقع پر سب اُستانیاں اپنی اپنی جماعتوں میں بچیوں کو نامور مسلمان خواتین کے بارے میں بتائیں گی۔ سکول میں اس دن کی مناسبت سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ہر اُستانی نے کسی نہ کسی مسلم خاتون کو اپنا موضوع بنایا۔

مناہل نے اپنی اُستانی سے پوچھا کہ وہ کس مسلم خاتون کے بارے میں ہماری جماعت میں بات کریں گی؟

اُس کی اُستانی نے کہا کہ ہم جماعت میں اُس روز ایک ایسی مسلمان لڑکی کے بارے میں بات کریں گے جس کی بہادری کا قصہ تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا گیا ہے۔ اگلے روز اُستانی صاحبہ نے جماعت میں سب بچوں کو کہا کہ وہ کل اپنی اُردو کی کتاب میں موجود نظم ''فاطمہ بنت عبداللہ'' پڑھ کر آئیں۔

مناہل نے اُس روز گھر جا کر اپنی والدہ سے نظم ''فاطمہ بنت عبداللہ'' سنی اور خود بھی اُس کے اشعار پر غور کرنے لگی۔ اگلے روز سب بچیوں کو انتظار تھا کہ اُن کی اُستانی صاحبہ اُن کو اُس مسلمان لڑکی کی زندگی اور اُس کی بہادری کے بارے میں بتائیں۔ سکول میں اُس روز معمول سے ہٹ کر سرگرمیاں جاری تھیں۔ سب جماعتوں میں کسی نہ کسی مسلم خاتون کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔

مناہل بھی اپنی جماعت میں انتظار میں بیٹھی تھی کہ اسی اثنا میں اُس کی اُستانی صاحبہ نے جماعت میں موجود تمام بچیوں کو مخاطب کیا اور خواتین کے عالمی دن کی مناسبت سے کچھ باتیں کرنے کے بعد اُنھوں نے تمام بچیوں کو کہا کہ وہ اُردو کی کتاب کھولیں اور نظم ''فاطمہ بنت عبداللہ'' والے صفحات کھول لیں۔ اُستانی صاحبہ نے چند بچیوں کو اپنے پاس بلایا اور اُنھیں یہ نظم بآواز بلند پڑھنے کو کہا۔

نظم کے اختتام پر اُستانی صاحبہ نے بچیوں کو کہا کہ فاطمہ بنت عبداللہ نظم ہمارے قومی شاعر علامہ محمد اقبال نے لکھی تھی۔ اِس نظم میں اُس لڑکی کی بہادری اور جرأت کو اُنھوں نے اُجاگر کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ فاطمہ جیسے اوصاف اپنی قوم کی لڑکیوں میں دیکھنا چاہتے تھے۔ فاطمہ کی عمر کوئی گیارہ برس کی تھی جب اُس کے ملک طرابلس پر اطالوی فوج نے حملہ کر دیا تھا۔ اُستانی صاحبہ نے فاطمہ بنت عبداللہ کے بارے میں بتانا شروع کیا کہ اُس چھوٹی سی لڑکی نے بھی ہمت کی اور اپنی قوم کے مردوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہوئی۔ اس جنگ میں مسلمان مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی شریک تھیں۔ عورتیں براہِ راست جنگ تو نہیں لڑ رہی تھیں لیکن وہ پچھلی صفوں میں زخمیوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھیں۔ انھی عورتوں میں فاطمہ بنت عبداللہ بھی شریک تھی۔ فاطمہ نے اس جنگ میں اپنی فوج کے سپاہیوں کو پانی پلانے کی ذمہ داری اُٹھائی۔ میدانِ جنگ میں ایک چھوٹی سی لڑکی کے لیے ایسی خدمت سر انجام دینا اتنا آسان نہ تھا جہاں ہر طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ جاری تھی۔ لیکن اُس نے بہادری سے بلاخوف و خطر یہ ذمہ داری نبھائی اور اپنے کام میں مصروف رہی۔

اُستانی صاحبہ نے مزید بتایا کہ پرانے زمانوں میں جب جنگیں لڑی جاتیں تھیں تو مردوں کے ساتھ ساتھ مسلمان عورتیں بھی اِسی طرح جنگوں میں شریک ہوتی تھیں۔ فاطمہ بھی ہمت و جرأت سے آگے بڑھتی اور ہر زخمی کی تیمارداری کرتی اور اُسے اپنے مشکیزے سے پانی پلاتی۔ شدید لڑائی میں ایک چھوٹی سی بچی کی ایسی بہادری قابلِ دید تھی جس کو اپنی موت کی کوئی پروانہ تھی اُسے بس ایک ہی فکر تھی کہ اُس نے اپنی فوج کے زخمی سپاہیوں کو پانی پلانا ہے۔ ابھی فاطمہ اپنے زخمی سپاہیوں کو پانی پلا رہی تھی کہ ایک اطالوی فوجی نے اُسے پکڑ کر کھینچا وہ گری اور اپنی فوج ہی کے ایک زخمی سپاہی کی تلوار پکڑ کر اُس اطالوی فوجی پر حملہ آور ہوئی۔ یہ ایک مسلمان لڑکی کا جذبۂ ایمان تھا کہ اُس نے ایسے زور کی تلوار چلائی کہ اُس اطالوی فوجی کا ایک ہاتھ کٹ گیا۔ اطالوی فوجی سے اُس کی یہ بہادری برداشت نہ ہوئی اور اُس نے غصہ میں آکر اپنی بندوق سے فاطمہ پر گولی داغ دی۔ یوں ایک مسلمان لڑکی نے جرأت و بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ فاطمہ جیسی جرأت مند لڑکی

نے میدانِ جنگ میں جس جذبۂ ایمانی سے اپنی فوج کی مدد کی یہ اُس کا نتیجہ تھا کہ اس لڑائی میں کم تعداد میں ہونے کے باوجود مسلمان فوج نے اطالوی فوج پر فتح حاصل کی۔

اُستانی صاحبہ نے اپنی بات ختم کی تو جماعت میں موجود اپنی شاگردوں سے کہا کہ اگر کوئی سوال کرنا چاہتا ہے تو وہ ضرور کرے۔

اتنے میں مناہل نے پوچھا کہ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ یہ لڑائی کب لڑی گئی اور طرابلس کہاں واقع ہے؟

اُستانی صاحبہ نے بتایا کہ یہ جنگ ۱۹۱۲ء میں لڑی گئی۔ طرابلس براعظم افریقہ کا ملک ہے، جس کا موجودہ نام لیبیا ہے۔

جماعت میں سے ثنا نے سوال کیا کہ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ علامہ محمد اقبال ہمیں اس نظم میں کیا پیغام دینا چاہ رہے ہیں؟

اُستانی صاحبہ نے کہا: مسلمان قوم بے عملی اور اپنی سستی کی وجہ سے پستی میں جا چکی تھی۔ علامہ محمد اقبال نے اپنی شاعری میں ہمیں حرکت، عمل اور جرأت کا پیغام دیا ہے۔ اس لیے آپ نے اس نظم میں ہمیں درس دیا ہے کہ ہم اگر کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں فاطمہ کی طرح جرأت اور بہادری سے کام لینا ہو گا۔ اس نظم میں ایک پیغام یہ بھی ہے کہ مسلمان عورتیں کسی بھی طرح اپنے مردوں سے پیچھے نہیں ہیں بلکہ وہ ہر میدان میں اُن کے شانہ بشانہ ہیں۔ کسی بھی قوم کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُس قوم کے مردوں کے ساتھ ساتھ اُس کی عورتوں کو بھی میدان میں نکلنا چاہیے۔ علامہ محمد اقبال فاطمہ بنت عبداللہ کے کارنامہ سے بہت خوش تھے کیونکہ ایک شہید کی موت کسی بھی قوم کی زندگی کا باعث بنتی ہے اور فاطمہ نے اس بات کو سچ ثابت کر کے دکھایا تھا۔ فاطمہ بنت عبداللہ کی شہادت کا یہ واقعہ ۱۳ نومبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں اُس کی تصویر کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ علامہ محمد اقبال نے اسی واقعہ سے متاثر ہو کر یہ نظم لکھی تھی اور اُس لڑکی کی جرأت اور بہادری کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اس اُمید کا اظہار کیا ہے کہ مسلمان قوم دوبارہ سربلندی حاصل کرے۔

آخر میں اُستانی صاحبہ نے تمام لڑکیوں کو بتایا کہ ہمیں بھی چاہیے کہ ہم اپنے آپ کو کسی سے کمتر نہ سمجھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں صلاحیتوں سے نوازا ہے ہمیں چاہیے کہ ہم اُن صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے حصہ کا کام ضرور کریں۔جب تک کسی بھی معاشرے کی عورت اپنے مردوں کے شانہ بشانہ ہر میدان میں ساتھ نہیں ہو گی وہ قوم بھی ترقی نہیں کر پائے گی۔ ہمیں چاہیے کہ ہم تعلیم حاصل کریں اور زندگی کے ہر شعبہ میں اپنا کردار نبھائیں۔ فاطمہ ایک چھوٹی سی لڑکی تھی لیکن اُس نے اپنی ہمت اور استطاعت سے جو کارنامہ سر انجام دیا وہ ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ آج ہمیں بھی یہ عہد کرنا ہو گا کہ ہم بھی اپنی تمام تر توانائیاں صرف کریں گے اور پاکستان کی ترقی و کامرانی میں اپنا کردار بھرپور طریقے سے نبھائیں گی۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے

کل سے تمام سکول کرونا وائرس کی وجہ سے بند کر دیے جائیں گے۔ ٹی وی پر یہ خبر جیسے ہی چلی موسیٰ اور مصطفی نے خوشی سے ایک نعرہ لگایا کہ سکول سے اب چھٹیاں ہوں گی اور ہم خوب کھیلیں، کودیں اور سیر و تفریح کریں گے۔ پاس بیٹھے اُن کے ابا جان دونوں کے چہروں پر خوشی کے آثار بخوبی دیکھ رہے تھے، اُنھوں نے سوچا کہ یہ بچے بھی کتنے معصوم ہیں جنھیں اس بات کا اندازہ ہی نہیں ہے کہ تعلیمی اداروں کو کس وجہ سے بند کیا گیا ہے، اُنھیں تو صرف اپنی چھٹیوں سے غرض ہے۔ لہٰذا وقتی طور پر ابا جان نے بچوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا۔ اگلے روز ٹی وی پر خبر چلی کے کرونا وائرس کی وجہ سے مکمل لاک ڈاؤن رہے گا اور عوام اپنے گھروں میں ہی رہیں اور بلاضرورت گھروں سے باہر نہ نکلیں۔ بچوں نے یہ خبر سنی تو انھیں یہ اندازہ تو ہو گیا کہ اب سیر و تفریح کا موقع تو میسر نہیں آئے گا اور نہ ہی پارک میں جا کر کھیلا جا سکے گا۔

گلیوں، بازاروں اور سڑکوں پر سناٹا چھا گیا اور ایک خوف کی لہر نے سب کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ بچے بھی گھر میں بیٹھے یہی سوچ رہے تھے کہ یہ کیسی چھٹیاں ہیں جن میں نہ تو ہم کھیل سکتے ہیں، نہ سیر و تفریح کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی سے ملنے کے لیے کہیں آنا جانا ہو گا۔ ابا جان کو بھی دفتر سے چھٹیاں ہو گئیں اور وہ بھی گھر پر بچوں کے ساتھ وقت گزارنے لگے۔

ابا جان نے اُنھیں بتایا کہ یہ وقت ہم سب پر ایک بڑا امتحان ہے۔ اب ہمیں صحیح معنوں میں ایک اچھا مسلمان اور سچا پاکستانی بننا ہے۔ ہم لوگوں کو چاہیے کہ مشکل کی اس گھڑی میں ہم اپنے ارد گرد کی بھی خبر رکھیں اور یہ دیکھیں کہ کسی کے بچے بھوکے تو نہیں سو رہے۔ ہمیں اسلام نے یہی درس دیا ہے کہ ہمسائیوں کے حقوق کا بھی خیال رکھا جائے۔ اب ہمیں عملی طور پر

اپنے آپ کو ایک اچھا انسان اور مسلمان بن کر دکھانا ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے کاروبار اس وبا کی وجہ سے بند ہو گئے ہیں اور وہ بے چارے اس وقت بیروزگار ہیں۔

موسیٰ نے بتایا: اُس کے ایک ہم جماعت کے والد کا کاروبار کئی دنوں سے بند ہے جس کی وجہ سے اُنھیں روزمرہ کے اخراجات میں مشکل پیش آرہی ہے۔

ابا جان نے بتایا: جیسا کہ موسیٰ نے اپنے ایک دوست کے ابو کا ذکر کیا ہے اِسی طرح اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ فلاں فلاں گھر میں یہ مشکل پیش آئی ہے تو ہمیں چاہیے کہ ہم خود سے یا پھر کچھ دوسرے افراد کی مدد سے اُن کی اس مشکل میں اُن کا ساتھ دیں۔ ہمارے مذہب نے بھی ہمیں یہ تلقین کی ہے اور حقوق العباد اِسی چیز کا نام ہے کہ ہم معلوم کریں کہ ہمارے ارد گرد کوئی بھوکا تو نہیں سویا اور کوئی کسی مشکل میں تو نہیں ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اگر ہم اُن کے گھر راشن دے سکتے ہیں تو ضرور اُن لوگوں کے گھروں میں بآسانی راشن پہنچائیں اور کوشش کریں کہ اس کی نمود و نمائش بالکل بھی نہ ہو، کیونکہ نیکی اگر اپنی نمود و نمائش کے لیے کی جائے تو اُس کا سارا اثر ضائع ہو جاتا ہے اور پھر جس کی مدد آپ کرتے ہیں تو اُس کی بھی عزتِ نفس مجروح ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ وہ بیچارہ شاید مشکل حالات کی وجہ سے آپ سے مدد تو لے لیکن اُس کے دل پر کیا گزرتی ہے، یہ وہی جانتا ہے۔ اس لیے کہتے ہیں کہ نیکی کر دریا میں ڈال۔ یعنی اگر آپ کوئی نیکی کا کام کرتے ہیں تو کسی دوسرے کو اس کی خبر بھی نہ ہو، ایسا کرنے سے آپ کا اپنا دل بھی مطمئن رہتا ہے اور جس کی آپ مدد کرتے ہیں اُس کے بھی دل سے آپ کے لیے دُعا نکلتی ہے۔

مصطفیٰ نے پوچھا: آپ ہمیں کچھ حقوق العباد کے بارے میں بھی بتائیے۔

ابا جان نے کہا: ہم پر دو طرح کے حقوق پورے کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے۔ ایک حقوق اللہ ہیں اور دوسرے حقوق العباد۔ حقوق اللہ میں تو ہمیں حکم ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرتے ہوئے اُس کی عبادت کریں جیسے نماز، روزہ، زکوۃ اور حج وغیرہ کی ادائیگی۔ اِسی طرح ہمیں دوسرے انسانوں کے بھی حقوق ادا کرنے کے لیے کہا گیا ہے جیسے ہمسائیوں، رشتہ داروں، غریبوں، مسکینوں اور ضرورت مندوں کے حقوق۔ ان

حقوق کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئیں، اُن کی ضرورتوں کا خیال رکھیں، کسی کو تکلیف نہ پہنچائیں، کسی بھوکے اور مسکین کو کھانا کھلائیں، ضرورت مند اور غریبوں کی مدد کریں، بڑوں کی عزت کریں، چھوٹوں سے پیار کریں۔

مصطفی فوراً بولا: یہ سب کام تو ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ نے بھی کیے ہیں، میں نے یہ اپنی کتاب میں پڑھا ہوا ہے۔

ابا جان نے کہا: ہاں! ہمارے پیارے نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ ہمارے لیے روشن مثال ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اُن کے اُسوہ حسنہ کو اختیار کرنے کا حکم ہمیں دیا ہے۔ تاکہ ہم بھی اُن کے طریقوں پر عمل کریں اور اچھے انسان بن کر معاشرے میں اپنا کردار ادا کریں۔

موسیٰ بولا: اگر ہم کسی ضرورت مند کو ضروری اشیاء نہ پہنچا سکیں تو کیا کوئی دوسرا راستہ بھی ہے ہمارے پاس؟

ابا جان نے کہا: ہاں! اگر ہم اُس تک راشن یا ضروری اشیاء نہ پہنچا سکیں تو ہم یہ کام بھی کر سکتے ہیں کہ اُن مستحق لوگوں میں روپیہ تقسیم کر دیں یا پھر اُن کے گھر خود کھانا پکا کر پہنچا دیں۔ جیسا کہ اگر ہم اپنے گھر گوشت یا مرغ مسلم کھاتے ہیں تو ہم اِن مشکل دنوں میں مہنگا کھانا کھانے سے اجتناب کریں اور خود بھی اگر عام اور سادہ خوراک کھالیں اور اُسی پیسہ سے جس سے ہم مہنگا کھانا کھاتے ہیں، اُس رقم سے ہم سادہ اور عام کھانا مثلاً دال روٹی یا سبزی وغیرہ بنا کر اتنے ہی پیسوں میں اُن لوگوں کا پیٹ بھی بھر سکتے ہیں۔ اس طرح ہمیں روحانی خوشی ہو گی اور اللہ تعالیٰ بھی ہمارے اس فعل سے خوش ہو گا۔

موسیٰ نے کہا: ہاں یہ تو اچھا ہو جائے گا کہ ہم اپنے گھر بھی سادہ خوراک بنالیں گے اور زیادہ بنالیں گے۔ زیادہ کھانا پکانے سے ہم اُس کھانے سے ضرور کسی نہ کسی کی مدد کر سکتے ہیں۔ جیسے کہ میں امی سے کہوں گا کہ آج بے شک سادہ کھانا تیار کریں اور آدھا کھانا میں اپنے دوست کے گھر چپکے سے دے آؤں گا تاکہ وہ لوگ بھی پیٹ بھر کر سوئیں۔

ابا جان نے کہا: یہ ہوئی نا بات۔ جتنا پیسہ ہم نے کھانے پر خرچ کرنا ہے پیسہ اتنا ہی خرچ ہو گا پیٹ بھرنے کے لیے لیکن اس سے یہ فائدہ ہو گا کہ وہ مستحق لوگ جن کو اس وقت ہماری ضرورت ہے وہ بھی اپنے بچوں کا پیٹ بھر سکیں گے۔

مصطفی نے کہا: اگر غریب لوگوں کو پیٹ بھرنے کے لیے کھانا نہ ملے تو اس کے کیا اثرات ہوں گے؟

ابا جان نے کہا: تم نے انتہائی اہم سوال کیا ہے۔ اگر انسان کو خوراک میسر نہ ہو تو وہ بھوکا رہے گا اور بھوکے پیٹ سونے سے ایک تو اُس کو اُسے بھرنے کی شدت سے ضرورت ہو گی، اُس کے گھر میں اُس کے بیوی، بچے یا والدین ہوں تو کب تک انسان بھوک برداشت کر سکتا ہے بھلا اگر اُس کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے تو وہ اپنا اور اپنے عیال کا پیٹ بھرنے کے لیے خدانخواستہ کوئی غلط طریقہ بھی اختیار کر سکتا ہے۔ غلط طریقہ سے مراد یہ ہے کہ وہ کوئی ایسا بدی کا کام کر سکتا ہے جسے ہمارے مذہب میں منع فرمایا گیا ہو یا حرام قرار دیا ہو۔ بُرے کاموں سے انسان کو وقت طور پر اپنی خواہش تو پوری ہوتی نظر آتی ہے لیکن اس سے نہ صرف اللہ تعالیٰ اور اُس کے نبی کریم ﷺ ناراض ہوتے ہیں بلکہ اس سے معاشرے میں بُرائیاں بھی جنم لیتی ہیں اور اگر معاشرے میں بُرائیاں عام ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سایہ بھی اُس معاشرے پر سے اُٹھ جاتا ہے۔ اس لیے اسلام نے ہمیں اخوت، مساوات، ہمدردی اور ایثار کا درس دیا ہے۔ جب کوئی شخص کسی ضرورت مند کی مدد کرتا ہے تو اُس سے اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوتا ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم دوسروں کے ساتھ عملی طور پر ہمدردی کریں۔

دونوں بچوں نے اپنے ابا جان کی بات کو بڑے غور سے سنا اور یہ کہا کہ ہم کوشش کریں گے کہ ہمارے دوست کے گھر والے بھوکے نہ سوئیں۔ بلکہ جب تک اُن کے ابو کا کام دوبارہ چل نہیں جاتا ہم بھی وہی کھانا کھائیں گے جو اُن کے گھر پہنچائیں گے اس طرح ہم مساوات کی ایک مثال بنیں گے۔

ابا جان نے جب بچوں کی یہ باتیں سنیں تو اُن کے چہرے پر تبسم آیا اور اُنھوں نے کہا کہ کیا آپ نے پڑھا نہیں کہ جب ہمارے نبی اکرم ﷺ کے وہ ساتھی جو مکہ سے اُن کے ساتھ

ہجرت کر کے مدینہ میں آئے تھے تو مدینہ کے لوگ، جو انصار کہلاتے تھے انھوں نے اپنے مہاجرین بھائیوں کی کس طرح مدد کی تھی۔ اگر کسی انصار صحابی کے پاس اُس کی ضرورت سے زائد چیز تھی تو اُس نے وہ شے اپنے مہاجر بھائی کو خوشی کے ساتھ دے دی تھی۔ مدینہ کی ریاست کی یہ مثال ہم سب کے لیے ایک زندہ جاوید مثال ہے۔ آج اس مشکل دور میں بھی ایسی ہی مثال بننے کی ضرورت ہے اور بحیثیت ایک مسلمان کے، ہم سب پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ ہم اپنے ضرورت مند بھائیوں کا خاص خیال رکھیں۔ ابا جان نے بچوں سے پوچھا کیا آپ نے ہمارے قومی شاعر علامہ محمد اقبال کی وہ نظم 'ہمدردی' نہیں پڑھی جس کے آخر میں اُنھوں نے کہا تھا:

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

دونوں بچوں نے یک زبان ہو کر کہا: ہاں جی! ہم نے وہ نظم پڑھی ہے اور آپ کی ساری گفتگو سے ہمیں اس شعر کی سمجھ بھی آگئی ہے کہ دُنیا میں وہی لوگ اچھے ہیں جو مشکل وقت میں دوسروں کی مدد کرتے ہیں اور ہم بھی وعدہ کرتے ہیں کہ ہم بھی کسی نہ کسی طرح دوسروں کی مدد کرتے رہیں گے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ ہم سے خوش ہو۔ دیکھا بچو! آپ نے بھی اس مشکل گھڑی میں اپنے ارد گرد اور دوستوں سے معلوم کرنا ہے کہ کیا کوئی پریشان تو نہیں یا کوئی بھوکا تو نہیں سویا۔ ہم مسلمان ہیں اور پاکستانی ہیں اور یہ دونوں خوبیاں اُسی وقت ہی پوری ہو سکتی ہیں جب ہم اچھے انسان بنیں گے۔

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا

سکول لگنے سے ذرا پہلے، جب تمام بچے ایک کشادہ میدان میں کھڑے تھے کہ قرآنِ مجید کی تلاوت کی آواز نے سب پر سحر طاری کر دیا۔ جیسے ہی تلاوت ختم ہوئی تو کچھ بچوں نے علامہ اقبال کی نظم 'لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری' پڑھنا شروع کی۔ نظم کے ہر مصرعے کو دوسرے بچوں نے بھی گنگنانا شروع کر دیا۔ گویا سکول کا ہر بچہ نظم کو اپنے خاص سُر میں گا رہا تھا۔

میدان میں موجود بچوں میں حمدان بھی نظم دھیمی آواز میں پڑھ رہا تھا۔ شاید اُس کے دل میں کچھ کرنے کی لگن تھی۔ اسمبلی ختم ہوئی اور تمام بچے اپنی اپنی قطار میں اپنی اپنی جماعتوں کی جانب چل پڑے۔ حمدان بھی اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ کمرۂ جماعت کی جانب بڑھا لیکن نظم کا ایک مصرع 'ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا' وہ بار بار گنگنا رہا تھا۔

اُستاد صاحب جماعت میں داخل ہوئے تو سب بچوں نے اُنھیں سلام کیا، اُستاد صاحب نے جواباً وعلیکم السلام کہا اور بچوں کو سبق پڑھانے میں مشغول ہو گئے۔ پہلا پیریڈ اسلامیات کا تھا اور اُستاد صاحب نے حضرت محمد ﷺ کی سیرت بیان کرنا شروع کی۔ دورانِ سبق اُنھوں نے بتایا کہ ہمارے نبی کریم ﷺ چھوٹوں پیار کرتے تھے اور غریبوں کی مدد کرتے تھے۔ بس یہ جملہ سننا تھا کہ حمدان نے اِسی دوران ذرا اُونچی آواز میں کہا کہ میں بھی غریبوں کی مدد کروں گا۔ اُستاد صاحب نے اُسے اپنے پاس بلایا اور بڑے پیار سے سمجھایا کہ یہ تو اچھی بات ہے لیکن اس طرح پڑھائی کے دوران اُونچی آواز میں بولنا مناسب نہیں۔ اگر آپ کو کچھ کہنا ہی ہے تو اُستاد صاحب کی بات مکمل ہونے کے بعد اُن سے اجازت طلب کریں اور پھر بات کریں۔ حمدان نے اُن سے معافی مانگی تو اُستاد صاحب نے کہا کہ اب بتاؤ کہ تمھیں آج یہ خیال کیسے آیا؟

حمدان نے بتایا کہ ہم روز صبح علامہ اقبال کی نظم سنتے ہیں لیکن ہم اُن کی باتوں پر عمل نہیں کرتے جبکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ 'عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی'۔ میں تو مسلمان ہوں اور میں جنت میں جانا چاہتا ہوں۔ اِس لیے میں چاہتا ہوں کہ میں بھی غریب لوگوں کی مدد کروں۔

اُستاد صاحب نے کہا کہ یہ تو بہت اچھی بات ہے کیونکہ جب ہم غریبوں کی مدد کرتے ہیں تو ہمیں راحت نصیب ہوتی ہے اور اس طرح اللہ بھی خوش ہوتا ہے۔ سب بچے بھی اب غور سے اُستاد صاحب کی بات سن رہے تھے۔

اُستاد صاحب نے مزید کہا کہ جب ہم کوئی نیکی کا کام کرتے ہیں تو اللہ ہمیں دُنیا میں بھی انعام دیتا ہے اور آخرت میں بھی اجر دے گا۔ انھوں نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ آپ سب بچوں کو آپ کے والدین جیب خرچ کے لیے جو پیسے دیتے ہیں، اُن میں سے آپ کچھ پیسوں سے غریبوں کی مدد کیا کرو۔ سب بچوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم ضرور ایسا کریں گے۔ انھی باتوں میں اسلامیات کا پیریڈ بھی ختم ہو گیا اور دوسرے مضامین کے لیے دوسرے اساتذہ کرام جماعت میں اپنے اپنے مضامین پڑھاتے رہے۔ جب چھٹی کی گھنٹی بجی تو آج حمدان بہت خوش تھا کہ وہ اب کسی نہ کسی غریب کی مدد ضرور کرے گا۔ وہ بھاگتا ہوا اپنے چھوٹے بھائی نعمان کے پاس گیا اور دونوں بھائی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے گھر کی جانب چل پڑے۔

راستے میں حمدان نے اپنے چھوٹے بھائی نعمان کو اُستاد صاحب کی بات بتائی اور اُسے کہا کہ وہ غریبوں کی مدد کرے گا۔ اس کے لیے وہ اُن پیسوں میں سے تھوڑے پیسے بچا لیا کرے گا اور اُن پیسوں سے کسی غریب کی کوئی نہ کوئی ضرورت پوری کرے گا۔ اُس نے گھر آ کر اپنے امی اور ابو کو یہ بات بتائی جس سے وہ دونوں بھی خوش ہوئے۔ اب وہ روزانہ کچھ پیسے بچا لیتا تھا اور اس انتظار میں رہتا تھا کہ اُسے نیکی کرنے کا کوئی موقع ملے۔

ایک روز ایسا ہوا کہ صبح سکول جاتے وقت حمدان اور نعمان کی نظر ایک غریب بچے پر پڑی جس کے بدن پر پھٹا ہوا یونیفارم تھا اور کتابیں، کاپیاں ایک لفافہ میں تھیں اور وہ بچہ

سڑک کے کنارے کھڑا دوسرے بچوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ دونوں بھائی اُس بچے کے پاس آئے اور اُس سے پوچھا کہ اُس کا بستہ کہاں ہے اور یہ کتابیں ایسے لفافے میں کیوں ڈالی ہوئی ہیں؟

بچہ روتے ہوئے بولا کہ اُس کے پاس کوئی بستہ نہیں ہے جس میں وہ یہ کتابیں ڈال سکے۔ دونوں بھائیوں نے اُس سے وعدہ کیا کہ وہ کل اُس کی یہ مشکل آسان کریں گے۔ دونوں بھائی سکول چلے گئے اور اُس دن انھوں نے گھر آ کر اپنے بچائے ہوئے پیسوں کو اکٹھا کیا تو اتنے پیسے بآسانی بن گئے کہ ایک اچھا سا بیگ خرید سکیں۔ شام کو اُن کے ابو گھر آئے تو اُنھوں نے اپنے ابو کو ساری بات بتائی اور کہا کہ وہ ابھی اُن کے ساتھ بازار چلیں تا کہ اُس بچے کے لیے ایک بیگ خریدیں تا کہ وہ اپنی کتابیں اُس میں رکھ سکے۔

دونوں بھائیوں نے اپنے پیسوں سے اُس بچے کے لیے ایک بستہ خریدا جبکہ اُن کے ابو نے انھیں اُس بچے کے لیے ایک عدد یونیفارم بھی لے کر دیا۔ اگلی صبح دونوں بھائی خود بخود جلدی اُٹھ گئے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور سکول کے لیے چل دیے۔ راستے میں وہ بچہ اُسی جگہ کھڑا تھا جہاں گزشتہ روز یہ تینوں ملے تھے۔ حمدان اور نعمان کے ابو بھی اُن کے ساتھ تھے۔ حمدان نے بچے کو نیا بستہ دیا اور کہا کہ اپنی سب کتابیں وہ اس میں ڈالے جبکہ نعمان نے اُسے یونیفارم پکڑایا اور کہا کہ کل سے وہ یہ نیا یونیفارم پہنے۔ بچہ بہت خوش ہوا اور دونوں بھائیوں کا شکریہ ادا کر کے سکول کی جانب چل دیا۔ یہ دونوں بھی اپنے سکول کی طرف بڑھے۔

آج تو حمدان بہت خوش تھا جیسے اُسے جنت مل گئی ہو۔ اُستاد صاحب نے جماعت میں اُس کے چہرے پر غیر معمولی مسکراہٹ سے پہچان لیا کہ اُس نے ضرور کوئی نیکی کا کام کیا ہے۔ اُنھوں نے اُسے اپنے پاس بلایا اور اُس سے پوچھا کہ آج وہ اتنا خوش کیوں ہے؟

حمدان نے سارا قصہ سنایا تو اُستاد صاحب نے اُسے پیار کیا اور کہا کہ واقعی تم نے ایک اچھا کام کیا ہے جس سے اللہ بھی راضی ہوتا ہے اور اُس کا رسول ﷺ بھی۔

اُستاد صاحب نے پھر سب بچوں کو مخاطب کیا کہ آج جو کام حمدان اور اُس کے بھائی نے کیا ہے وہ بلاشبہ ایک نیک کام ہے اور اللہ تعالیٰ اُس کو اِس کام کا ضرور اجر دیں گے۔ انھوں نے

بچوں کو تاکید کہ وہ سب بھی ایسے ہی نیکی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کریں تاکہ اُن کی وجہ سے دوسروں کو فائدہ ہو۔

دیکھا بچو! حمدان نے کیسے اُس غریب لڑکے کی مدد کی اب وہ بچہ خوشی خوشی روزانہ سکول جاتا ہے۔ حمدان نے نیکی کا کام کیا ہے اور اسلام ہمیں اسی بات کی تلقین کرتا ہے کہ ہم اخوت یعنی بھائی چارہ سے رہیں اور بے سہارا، غریب اور مفلس لوگوں کی جہاں تک ممکن ہو مدد کریں، اسی لیے علامہ اقبال نے کہا تھا کہ:

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

کیلنڈر پر جیسے ہی مارچ کا مہینہ نظر آیا، معاذ کی آنکھیں ٹکٹکی باندھ کر ۲۳ تاریخ کو دیکھنے لگیں۔ ۲۳ مارچ کی تاریخ لال رنگ میں تھی جبکہ باقی تمام تاریخیں کالے رنگ سے لکھی ہوئیں تھیں۔ ۲۳ تاریخ کے ساتھ یومِ پاکستان بھی لکھا ہوا تھا۔ معاذ نے سوچا کہ ہر سال اس روز ہمیں چھٹی ہوتی ہے اور لال رنگ میں اس تاریخ کو لکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دن کی کوئی خاص اہمیت ہے۔ کیوں نہ اپنے بابا جان سے اس کی تفصیل پوچھی جائے۔

اُس نے اُس روز بابا جان سے کہا کہ آپ مجھے ۲۳ مارچ کی تاریخی حیثیت سے آگاہ کیجیے۔

بابا جان نے کہا کہ یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ آپ یومِ پاکستان کے متعلق جاننا چاہتے ہیں۔ بابا جان نے کہا کہ آپ اپنے چھوٹے بھائی معیز کو بھی بتاؤ اور دونوں بھائی میرے مطالعے کے کمرے (سٹڈی روم) میں آجاؤ۔ معاذ نے اپنے چھوٹے بھائی معیز کو ساتھ لیا اور دونوں اپنے بابا جان کے مطالعہ والے کمرے میں چلے گئے جہاں اُن کے بابا جان پہلے سے موجود تھے اور اُن کے سامنے میز پر چند کتب پڑی ہوئی تھیں۔ دونوں بچے اپنے بابا جان کے سامنے بیٹھ گئے۔

بابا جان نے بتایا کہ آپ دونوں کو یہ تو معلوم ہو گا کہ پاکستان کا خواب علامہ محمد اقبال نے دیکھا تھا اُنھوں نے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے دوران اپنے صدارتی خطبے میں ایک آزاد اسلامی ریاست کا تصور پیش کیا تھا۔ اُن کا یہ خطبہ 'خطبہ الٰہ آباد' کے نام سے مشہور ہے۔ اِس خطبہ میں اُنھوں نے مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک علیحدہ اسلامی ریاست بنانے کی تجویز پیش کی تھی۔ علامہ محمد اقبال کی اس تجویز کو ہندوستان کے مسلمانوں نے قبول کیا تھا اور آزاد اسلامی ریاست کے حصول کے لیے اپنی کوششیں تیز کر دی تھیں۔ اس کے بعد لندن میں ہونے والی تینوں گول میز کانفرنسوں میں بھی مسلم عمائدین نے ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے ایک الگ اسلامی ریاست کا مطالبہ کیا۔

علامہ محمد اقبال دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے وہیں آپ کی ملاقات قائداعظم محمد علی جناح سے ہوئی اور آپ نے اُن کو قائل کیا کہ وہ ہندوستان آئیں اور مسلمانانِ ہند کی قیادت سنبھالیں۔ قائداعظم محمد علی جناح جب برطانیہ سے واپس ہندوستان تشریف لائے تو علامہ محمد اقبال نے اُنھیں خطوط لکھے جن میں ہندوستان کے سیاسی حالات و واقعات پر نہ صرف اُنھیں آگاہ کیا بلکہ اُن کو بے حد مفید مشورے بھی دیے۔ آپ ہی کی خواہش اور تجویز پر آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ آپ نے اپنے ایک خط مورخہ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء میں قائداعظم محمد علی جناح کو لکھا:

پنجاب میں آل انڈیا مسلم لیگ سے دلچسپی بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور لاہور میں مسلم لیگ کے آئندہ اجلاس کا انعقاد پنجاب کے مسلمانوں میں ایک نئی سیاسی بیداری کا باعث ہو گا۔

اسی طرح آپ اپنے ایک اور خط میں مورخہ ۱۱ اگست ۱۹۳۷ء میں قائداعظم محمد علی جناح کو تحریر کرتے ہیں کہ:

پنجاب میں مسلم لیگ کے لیے جوش و خروش برابر بڑھ رہا ہے اور مجھے قوی اُمید ہے کہ لاہور میں اس کا اجلاس مسلم لیگ کی تاریخ میں ایک انقلاب آفریں باب اور عوام سے رابطہ استوار کرنے کے لیے ایک اہم ذریعہ ثابت ہو گا۔

لیکن اس اجلاس سے قبل علامہ محمد اقبال ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں وفات پا گئے۔ آپ ہی کی خواہش اور تجویز پر لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ۲۱ تا ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء کو منٹو پارک میں منعقد ہوا۔ قائداعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت میں پورے ہندوستان سے مسلمان لاہور میں اکٹھے ہوئے اور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو شیر بنگال مولوی اے۔ کے فضل الحق نے الگ اسلامی ریاست کے لیے قرارداد پیش کی جسے کثرتِ رائے سے منظور کر لیا گیا۔ یہ قرارداد "قراردادِ لاہور" تھی جسے ہندوؤں نے خود ہی "قراردادِ پاکستان" کہنا شروع کر دیا۔ یہ ایک تاریخ ساز دن تھا جب تمام مسلمان ایک علیحدہ آزاد اسلامی ریاست کے لیے متفق تھے۔ اس تاریخی دن کے بعد آزاد اسلامی ریاست کے حصول کے لیے تحریکِ

پاکستان میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا اور آزاد اسلامی ریاست کا مطالبہ گھر گھر پہنچا۔ اس لیے اس دن یعنی ۲۳ مارچ کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے کیونکہ یہ ایک تاریخ ساز دن تھا جب ہندوستان کے تمام مسلمان مسلم لیگ کے پرچم تلے اکٹھے تھے اور سب یہی مطالبہ اور نعرہ لگا رہے تھے کہ:

"لے کے رہیں گے پاکستان
بن کر رہے گا پاکستان"

قائداعظم محمد علی جناح کی کرشماتی قیادت میں برصغیر کے مسلمانوں نے انتھک محنت کے بعد بالآخر ۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب پاکستان حاصل کر لیا۔

معاذ: جس جگہ پر یہ قرارداد منظور ہوئی تھی وہاں یادگار کے طور پر مینارِ پاکستان بنایا گیا۔

بابا جان: آپ ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ ایک وسیع و عریض میدان تھا جس کا نام منٹو پارک تھا۔ جس جگہ پر قائداعظم محمد علی جناح کے لیے سٹیج تیار کیا گیا تھا ٹھیک اُسی جگہ پر مینارِ پاکستان کی تعمیر ہوئی۔ اس جگہ کی نشاندہی میاں امیر الدین نے کی تھی، جو اُس جلسہ میں خود بھی موجود تھے۔

اب اس جگہ کو گریٹر اقبال پارک کا نام دیا گیا ہے۔

معیز: ہمیں کچھ مینارِ پاکستان کے بارے میں بھی بتائیے؟

بابا جان: جب پاکستان ۱۹۴۷ء میں قائم ہو گیا تو کچھ عرصہ بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ جہاں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی تھی وہاں ایک یادگار تعمیر کی جائے۔ چنانچہ ۲۳ مارچ ۱۹۶۰ء کو اس کی تعمیر شروع ہوئی اور اس کی تکمیل ۲۱ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو ہوئی۔ مینارِ پاکستان کو یادگارِ پاکستان بھی کہا جاتا ہے جس کا نقشہ ترکی کے نصر الدین مرات خان نے تیار کیا تھا اور یہ ۷۵ لاکھ میں تعمیر ہوا تھا۔ مینارِ پاکستان کی بلندی ۱۹۶ فٹ ہے اور بلندی تک پہنچنے کے لیے ۳۲۴ سیڑھیاں ہیں۔ مینار کا نچلا حصہ ایک پھول کی مشابہت رکھتا ہے جبکہ اس کے چبوترے پر پانچ کونوں والا ستارہ اور دو چاند بنے ہوئے ہیں۔ اس کی دیواروں پر قرآن مجید کی آیات، قراردادِ دہلی کا اقتباس، قائداعظم محمد علی جناح کے اقوال، علامہ محمد اقبال کی دو نظمیں "صبح" اور

"لا الہ الا اللہ" جو ضربِ کلیم میں ہیں، قومی ترانہ اور پاکستان کی آزادی کی مختصر تاریخ کندہ ہے۔ جبکہ قراردادِ پاکستان کا مکمل متن اُردو اور بنگالی زبانوں میں دیواروں پر کندہ کیا گیا ہے۔ اب مینارِ پاکستان کے احاطے میں خوبصورت فوارے، جھیل اور باغیچے تعمیر ہوئے ہیں جن سے اس کے حسن میں اضافہ ہوا ہے۔ پاکستان کے قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری کا مزار بھی مینارِ پاکستان کے احاطے میں ہے۔ مینارِ پاکستان محض سنگ و خشت کا بنا ہوا چبوترہ ہی نہیں ہے بلکہ پاکستان کی قومی تاریخ کا روشن سنگِ میل ہے۔

باباجان نے بچوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ یہ دن ہم سے تجدیدِ وفا کراتا ہے کہ ہم آپس میں تمام اختلافات بُھلا کر ایک قوم بنیں۔ ۱۹۴۷ء میں قوم ایک تھی جس کو ایک وطن کی ضرورت تھی اب ہمارے پاس وطن ہے لیکن ہماری قوم مختلف لسانی، صوبائی، مذہبی اور سیاسی گروہ بندیوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ یومِ پاکستان ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہم آپس میں اتفاق و اتحاد کے ساتھ رہیں اور پاکستان کی تعمیر و ترقی کے لیے کام کریں۔ ان شاء اللہ وہ وقت دُور نہیں جب ہم پاکستان کو دُنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں دیکھیں گے اور یہاں کے لوگ ایک مرتبہ پھر ایک پرچم تلے جمع ہو کر اس کو حقیقی معنوں میں ایک آزاد اسلامی ریاست بنائیں گے۔ یہی پیغام ہمیں علامہ محمد اقبال کے اس شعر سے بھی ملتا ہے:

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

میں راہ میں روشنی کروں گا

رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس پُر سکون ماحول میں احمد علی مطالعے میں مصروف تھا۔ اُسے قائداعظم محمد علی جناح پر ایک اچھا سا مضمون لکھنا تھا تاکہ وہ سکول میں یومِ قائد کے سلسلے میں ہونے والی تقریب میں حصہ لے سکے۔ اس کے لیے وہ قائداعظم محمد علی جناح پر لکھی گئی چند کتابیں پڑھنے میں مصروف تھا۔ یہ کتب قائداعظم کی شخصیت اور اُن کے فرمودات پر مشتمل تھیں۔ مطالعے میں مسلسل مصروف رہنے کی وجہ سے احمد علی تھوڑی تھکن محسوس کرنے لگا تو وہ اُٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ وہ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ رات کے سناٹے اور تاریکی میں اُسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ گلی میں موجود ایک بجلی کے کھمبے کے آس پاس تھوڑی سی روشنی تھی، جس کی وجہ سے اُس تھوڑی سی جگہ کو صاف طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ احمد علی کھڑکی کے پاس کھڑا کچھ سوچنے لگا۔ اچانک اُس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اگر روشنی ہو تو تاریکی ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے اس بجلی کے کھمبے کی وجہ سے گلی میں صرف وہی جگہ واضح نظر آ رہی ہے جہاں تک اُس کی روشنی جا رہی ہے۔

وہ ابھی اِنھی سوچوں میں گم تھا کہ اُس کے ذہن میں فوراً وہ ساری باتیں آنے لگیں جو اُس نے قائداعظم محمد علی جناح کے بارے میں چند لمحات قبل اپنی کتب میں پڑھی تھیں۔ اُس نے کتب میں پڑھا تھا کہ برصغیر کے مسلمان اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے اُنھیں روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ایسے میں قائداعظم محمد علی جناح نے اُنھیں اُمید دلائی اور اُن کے لیے راہوں میں روشنی کی۔ جب مسلمانوں کو یہ یقین ہو گیا کہ قائداعظم کی رہنمائی میں وہ اپنی منزل کے حصول کے لیے اندھیروں کو چھوڑ کر روشنی کو اپنا لیں گے تو وہ ایک آزاد اسلامی ریاست کو معرضِ وجود میں لا سکتے ہیں۔ وہ کھڑکی میں کھڑا مسکرایا اور آرام کی غرض سے بستر پر جا لیٹا۔

اگلی صبح اُس نے اپنے والد گرامی سے رات والے قصے کی بات کی اور اپنے مطالعے سے متعلق قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت پر کچھ باتیں بھی کیں۔

والد صاحب اُس کی اِن باتوں کو سن کر مسکرائے اور اُس سے مخاطب ہوئے۔ تم نے بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے۔ جب ہر طرف اندھیرا چھا جاتا ہے تو کچھ دکھائی نہیں دیتا، ایسے میں انسان مایوس اور کم ہمت ہو جاتا ہے۔ اُسے کچھ سجھائی نہیں دیتا کہ اُس نے کس طرف جانا ہے۔ ایسے میں وہ اپنی منزل کی جانب بھی نہیں بڑھ سکتا۔ ایسی ہی حالت اُس وقت مسلمانوں کی تھی۔ برصغیر میں ایک لمبے عرصہ تک حکومت کرنے کے بعد وہ بھی ایسے ہی اندھیرے میں ڈوب چکے تھے۔ اُن کے سامنے اُمید ختم ہو چکی تھی۔ ایسے میں کچھ عظیم مسلمان رہنماؤں نے مسلمانوں کی حالتِ زار کو دیکھتے ہوئے اپنا اپنا کردار ادا کیا۔ سرسید احمد خاں نے اُنھیں تعلیم کی طرف رغبت دلائی تو علامہ اقبال نے اُن کے لیے منزل کا تعین کیا۔ مسلمانوں کو کچھ اُمید پیدا ہوئی تو ایسے میں قائداعظم محمد علی جناح نے مسلمانوں کی قیادت کا بیڑا اُٹھایا اور اُن پر سے اُن اندھیروں کو دُور کر دیا جو گزشتہ ایک صدی سے زائد عرصہ پر محیط تھے۔ آپ نے اُن کی منزل کے حصول کے لیے اُن راہوں پر روشنی کی جو علامہ اقبال نے متعین کی تھیں۔ اندھیروں کے بادل چھٹنے لگے اور روشنی کی کرنیں پھیلنے لگیں۔ قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں مسلمانوں کو اپنی منزل نظر آنے لگی اور اُنھوں نے پُراُمید ہو کر پاکستان کو حاصل کرنے کے لیے بھرپور محنت کی۔ علامہ اقبال کا پیغام چونکہ قرآنی فکر پر متعین تھا اس لیے وہ روشن تھا جسے قائداعظم نے عملی جامہ پہنایا۔ قائداعظم کی قیادت میں مسلمانوں نے آخر کار پاکستان کو حاصل کر لیا۔ قائداعظم محمد علی جناح ہمارے لیے اُس مثال کی مانند ہیں کہ جب رات کو کوئی کارواں سفر پر نکلتا ہے تو کاروان کے سردار کے ہاتھ میں ایک مشعل ہوتی ہے جو آنے والے راستے پر روشنی کرتی ہے اور اُس سردار کی قیادت میں باقی قافلہ اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ اگر قافلے کا سردار درست سمت میں اپنے سفر کو جاری رکھے تو منزل مل ہی جاتی ہے۔ پاکستان کی کہانی بھی کچھ ایسی ہی ہے کہ علامہ اقبال نے نہ صرف منزل کا تعین کیا بلکہ اُس منزل کو پانے کے لیے راہ بھی ہموار کی۔ اُسی راہ پر قائداعظم نے مسلمانوں کی

قیادت کی اور منزل کو حاصل کر کے دکھایا۔ اب احمد علی کو ساری بات سمجھ آگئی تھی اور اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی اپنی قوم کے لیے ایسے ہی روشنی فراہم کرے گا تاکہ وہ ملک و قوم کی ترقی و کامرانی میں اپنا کردار ادا کر سکے۔ اُس کے والد صاحب نے مزید سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کسی نہ کسی مقصد کے لیے پیدا کیا ہے ہمیں چاہیے کہ ہم بھی اپنے حصے کی شمع روشن کرتے جائیں اور آنے والوں کے لیے روشنی فراہم کرتے رہیں۔

کچھ دنوں بعد سکول میں یوم قائد کی تقریب ہوئی اور احمد علی نے اس یادگار موقع پر قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت پر خوب روشنی ڈالی اور اپنے اساتذہ سے خوب داد وصول کی۔ میرے وطن کے پیارے بچو! آپ کو بھی احمد علی کی طرح روشن کرن بننا چاہیے تاکہ آپ بھی پاکستان کی ترقی و کامیابی میں اپنا فعال کردار ادا کر سکیں۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں

یہ کائنات اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے۔ اس میں موجود ہر چیز اُسی کی ہی بنائی ہوئی ہے اور وہ ہر شے کو بنانے میں قدرت رکھتا ہے۔ کوئی بھی چیز اُس نے بے کار پیدا نہیں کی۔ ہر تخلیق میں اُس کی کوئی نہ کوئی حکمت ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ اُس کی بنائی ہوئی کسی بھی چیز کو فالتو نہ سمجھا جائے۔ بلکہ جو اشیاء ہمیں بے کار نظر آتی ہیں اُنھیں کسی نہ کسی طرح استعمال میں لانا چاہیے یا پھر اُنھیں کسی اور کو دے دینا چاہیے تاکہ وہ اُن سے فائدہ اُٹھائے۔ یہ باتیں دادا ابو اپنے نواسوں اور پوتوں کو بتا رہے تھے کہ معاذ بولا:

ہاں جی! ہمیں بھی ایسے ہی کرنا چاہیے۔

دادا ابو نے اُسے کہا کہ بھئی تم کیا کرو گے اس کے لیے؟

معاذ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا کہ آپ ہی بتا دیں۔

دادا ابو نے اُسے کہا کہ اگلے مہینے آپ سب بچوں کے سالانہ امتحان ہوں گے۔ آپ سب بچے محنت کرو گے اور اپنے اپنے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد سب بچے اپنی نئی جماعتوں میں منتقل کر دیے جاؤ گے۔ نئی جماعتوں میں آپ سب کے پاس نئے بستے، نئی کتابیں اور کاپیاں وغیرہ ہوں گی۔

محمد علی بولا کہ ایسا تو ہر سال ہوتا ہے ہم جب بھی نئی جماعت میں جاتے ہیں تو ہمیں ہمارے ابو نئی کتابیں، کاپیاں اور بستہ خرید کر دیتے ہیں اور ہم خوشی خوشی نیا کورس پڑھتے ہیں۔

دادا ابو نے پوچھا کہ یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن پرانی کتابوں کا آپ لوگ کیا کرتے ہو؟

سبحان نے بتایا کہ وہ تو اپنی پرانی کاپیاں اور کتابیں رَدّی والوں کو دے دیتا ہے۔

احمد علی بولا کہ وہ تو اُن پرانی کتابوں اور کاپیوں کے صفحے پھاڑ کر کھیلتا ہے۔

دادا ابو نے بچوں کو سمجھایا کہ دیکھو بچو! جیسا کہ میں نے بتایا تھا کہ کوئی بھی چیز بیکار نہیں ہوتی۔ ہاں اگر اب یہ کتابیں آپ کے کام میں نہیں آسکتیں تو کیا کسی اور کے کام بھی نہیں آ سکتیں کیا؟ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی ایسی چیزوں کو جو اب ہمارے کام کی نہیں رہیں اُنھیں اُن ضرورت مند لوگوں کو دے دیں جن کے یہ مزید کام آسکتی ہیں تو کتنا اچھا ہو۔

موسیٰ فوراً بولا کہ ہم کیوں اپنی کتابیں کسی کو دیں؟

دادا ابو نے اُسے بڑے پیار سے سمجھایا کہ اسلام ہمارا دین ہے اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ہم غریبوں اور مساکین کی مدد کریں۔ یہی تعلیم ہمیں ہمارے پیارے نبی ﷺ نے بھی دی۔ آپ ﷺ خود بھی غریبوں کی مدد کرتے تھے اور ہمیں چاہیے کہ ہم بھی غریبوں کی مدد کریں۔

یحییٰ بولا کہ ہم کتابوں سے کیسے غریبوں کی مدد کرسکتے ہیں؟

دادا ابو نے اُس کو بتایا کہ ہم کتابوں سے غریبوں کی مدد کیوں نہیں کرسکتے بھلا؟

سب بچے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگ گئے اور سب کے ذہنوں میں ایک ہی سوال تھا کہ کتابوں سے بھلا کیسے غریبوں کی مدد کی جاسکتی ہے؟

فاطمہ فوراً بولی کہ ہاں ہم اپنی کتابیں غریبوں کو دے دیں گے اور اُن کی مدد ہو جائے گی۔

دادا ابو نے کہا کہ بات تو تمھاری ٹھیک ہے لیکن اس پر عمل کیسے کیا جاسکتا ہے؟

سب بچے اب غور سے دادا ابو کی طرف دیکھ رہے تھے کہ جیسے اُنھیں کوئی کسی بات کا انتظار تھا۔ دادا ابو بھی سمجھ گئے کہ بچوں کی نظریں اُن پر کیوں جم گئی ہیں۔ دادا ابو نے بچوں کو بتایا کہ ہم سب مسلمان ہیں اور ہمیں چاہیے کہ اپنے نبی پاک ﷺ کے طریقہ پر عمل کرتے ہوئے ہم اپنے اِرد گرد کی خبر گیری بھی کریں۔ ہم پر کچھ ایسے فرائض ہیں جنھیں ہم حقوق العباد کہتے ہیں۔

معیز بولا کہ بالکل دادا ابو میں نے اپنی کتاب میں پڑھا ہے کہ یہ حقوق اللہ کے بندوں کے ہیں اور ہمیں چاہیے کہ ہم اُن کو بھی عبادت کے ساتھ ساتھ پورا کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔

دادا ابو نے کہا کہ ہاں اللہ کی مخلوق کی خدمت خود ایک عبادت ہے، جس سے انسان کا اپنا اخلاق بھی اچھا ہوتا ہے اور جس کا اخلاق اچھا ہوتا ہے اُس کا ایمان بھی اُسی قدر مضبوط ہوتا ہے۔ تو کیوں نہ ہم بھی ایسے کام کریں جس سے اللہ بھی خوش ہو اور ہمارے پیارے نبی ﷺ بھی۔ جیسا کہ میں آپ کو بتا رہا تھا کہ کتابوں سے ہم غریبوں کی مدد کیسے کریں گے تو اس کا آسان حل تو یہ ہے کہ جب آپ اگلے ماہ سالانہ امتحانات سے فارغ ہوں اور کامیابی کے بعد اگلی جماعت میں چلے جائیں تو اپنی پچھلی جماعت کی کتب کو سنبھال لیں۔ آپ دیکھیں کہ آپ کے محلے یا علاقے میں کوئی غریب تو نہیں ہے جو اپنے بچوں کو کتب نہ دلا سکتا ہو یا جس کے پاس نئی جماعت کی کتب خریدنے کے لیے پیسے نہ ہوں۔ آپ انھیں اپنی پرانی کتابیں اور بستہ دے دیں تاکہ وہ اپنی پڑھائی نئے سال میں بھی جاری رکھ سکیں۔ اس طرح اُن کی مدد بھی ہو جائے گی اور اُن کے والدین پر بوجھ بھی نہیں پڑے گا۔ ہمارا دین ہمیں دوسروں کے ساتھ ہمدردی اور اُن کی مدد کا ہی درس دیتا ہے۔ اس لیے میں آپ سب کو یہ کہتا ہوں کہ آپ اپنی کتب کو صاف رکھا کریں اور جب اُن کی ضرورت نہ ہو تو کسی ضرورت مند کو دے کر اُن کی ضرورت پوری کریں اس سے ہمارا رَب اور ہمارے نبی پاک ﷺ بھی خوش ہوں گے۔

منال بولی کہ کتابیں اور بستہ تو ہم غریبوں کو دے ہی دیں گے لیکن پھر ہماری کاپیوں کا کیا بنے گا۔ وہ تو پھر بھی بے کار ہی رہیں گی۔

دادا ابو بولے کہ وہ بھی بیکار نہیں ہیں۔

سالار نے کہا کہ ہم نے تو اُن پر کام کیا ہوا ہے وہ بھلا کیسے کسی دوسرے کے کام آسکتی ہیں؟

دادا ابو نے بتایا کہ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ آپ سب بچوں نے اپنی اپنی کاپیوں پر کام کیا ہوا ہے۔ لیکن وہ پھر بھی ضرورت مندوں کے کام آسکتی ہیں۔

اب سب بچے حیران تھے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دادا ابو نے بتایا کہ یہ تو آپ سب نے بتا دیا کہ کاپیاں تو کام سے بھری ہوئی ہیں لیکن ان سے مزید کیا کام لیا جا سکتا ہے اب وہ بھی سن لو کہ اُن کاپیوں کو اگر ہم رَدّی میں بیچ دیں اور

اُس سے جو پیسے ملیں تو کیا اُن پیسوں سے کسی کی مدد نہیں کی جاسکتی؟ آپ نے اپنے بستے اور پرانی کتب تو ضرورت مند بچوں کو دینے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو کیا یہ بھی اچھا ہو کہ کاپیوں سے حاصل ہونے والے پیسوں سے اگر اُن بچوں کے لیے کچھ کاپیاں یا پھر سٹیشنری کی اشیاء خرید لی جائیں اور وہ بچوں میں تقسیم کر دی جائیں تو اُن کی مزید مدد ہو جائے گی۔ اسلام ہمیں اسی اخوت اور رواداری کا درس دیتا ہے تاکہ ایک بہترین معاشرہ قائم ہو۔ جب ایک اچھا معاشرہ قائم ہو گا تو پاکستان بھی ترقی کرے گا اور پاکستان میں بسنے والے لوگ بھی خوشحال ہوں گے۔

سب بچوں نے دادا ابو سے وعدہ کیا کہ وہ اب کسی بھی چیز کو بیکار نہیں سمجھیں گے بلکہ کوشش کریں گے کہ جو چیزیں اُن کے استعمال میں نہ ہوں تو اُنھیں ضرورت مندوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ سب بچوں نے دادا ابو کا شکریہ ادا کیا کہ اُنھوں نے اُنھیں نیکی کی بات بتائی ہے جس پر عمل کرتے ہوئے وہ غریب بچوں کی تعلیم جاری رکھنے میں اپنا اپنا کردار نبھاتے رہیں گے۔

سنو بچو! جس طرح ان بچوں نے اپنے دادا ابو سے وعدہ کیا ہے آپ سب کو بھی چاہیے کہ جب آپ سالانہ امتحانات سے فارغ ہوں اور نئی جماعت میں جائیں تو اپنی پرانی کتابیں اور ایسی چیزیں غریب بچوں میں ضرور تقسیم کریں تاکہ جو ضرورت مند لوگ اپنے بچوں کو بھی تعلیم جیسی نعمت دلوانا چاہتے ہیں لیکن وسائل کی کمی کا شکار ہیں، اُن کی مدد کی جائے۔ ہم سب اپنے اپنے طور پر ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں اور عمل سے معاشرے میں خوشیاں بکھیر سکتے ہیں۔ کسی غریب کے چہرے پر خوشی آناجنت کے حصول کا باعث بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوتا ہے اور ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ کی تعلیم بھی یہی ہے۔ ایسے چھوٹے چھوٹے کام کرنے سے روح کو بھی سکون ملتا ہے اور پاکستان بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہو گا۔ اس لیے آپ کسی بھی چیز کو حقیر نہ سمجھیں۔ اسی لیے شاعرِ مشرق نے فرمایا تھا کہ:

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

راشد سکول سے گھر آیا تو اُس نے کہا کہ مجھے علامہ محمد اقبال کی نظم 'بچے کی دُعا' یاد کرنی ہے کیونکہ چند دنوں بعد ہمارے سکول میں یومِ اقبال کی تقریب منعقد ہو گی جس میں مجھے یہ نظم سنانی ہے۔ اُس کے نانا ابو نے اُس کی یہ بات سنی تو وہ خوش ہوئے اور اُس سے کہا کہ یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ تم یومِ اقبال کے لیے یہ نظم یاد کرو گے۔ نانا ابو نے اُس سے کہا کہ تم ایسا کرو کہ پہلے اپنے سب کاموں سے فارغ ہو جاؤ اور میرے پاس شام کو آ جانا میں تمھیں یہ نظم یاد کروادوں گا۔

شام کا وقت تھا اور نانا ابو گھر کے باغیچے میں تشریف فرما تھے۔ اُسی لمحے راشد بھی سکول کا کام مکمل کر کے اور عصر کی نماز پڑھ کر سیدھا باغیچے میں آ گیا۔ نانا ابو اُس کو دیکھ کر مسکرائے۔ اُس نے اُنھیں سلام کیا اور پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

نانا ابو نے اُس کو کہا کہ یہ نظم علامہ محمد اقبال نے بظاہر تو بچوں کے لیے ہی لکھی ہے لیکن اس میں اُن کی خودی کا نظریہ جھلکتا ہے۔ اب راشد کے لیے تجسس بڑھ گیا کہ یہ خودی کیا چیز ہے؟ کیونکہ وہ اِس کے متعلق کئی مرتبہ سکول میں سن چکا تھا اور اُس کے ذہن میں خودی کو بلند کرتا والا شعر بھی آ گیا۔ نانا ابو نے بتانا شروع کیا کہ علامہ محمد اقبال کے نزدیک خودی معرفتِ الٰہی کا دوسرا نام ہے۔ یعنی خدا کی ذات کو پہچاننا، یہی خودی ہے۔

راشد نے نانا ابو کی باتوں میں دلچسپی لینا شروع کی۔ نانا ابو نے اُس کو بتایا کہ اگر نظم کے اشعار پر غور کریں تو ان میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ابتداء میں بچہ دُعا مانگتا ہے کہ 'زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری' جبکہ نصف نظم میں یہ دُعا کچھ ایسا رُوپ دھارتی ہے 'زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب'۔ یعنی جس معبود کو بچے نے شروع میں 'خدایا' کہہ کر پکارا تھا وہ نظم کے وسط میں آ کر 'یارب' کہلاتا ہے۔ یعنی یہ خودی کے مراحل ہیں جو لمحہ بہ

لمحہ تبدیل ہو رہے ہیں۔ دلچسپ بات اس نظم میں یہ ہے کہ وہی بچہ جو معبود کو نظم میں پہلے 'خدایا' اور پھر 'یارب' پکارتا ہے نظم کے اختتام پر معبود سے اس طرح دُعا گو ہے 'مرے اللہ! بُرائی سے بچانا مجھ کو'۔ یہ خودی کی تعمیر کے پہلو ہیں کہ معبود کو کیسے پہچانا؟ یہ دُعا کسی منزل کی نشاندہی ہے جو مختلف راستوں سے گزرنے کے بعد حاصل ہوئی۔ نظم کے آغاز پر جب بچہ لفظ 'خدایا' کہتا ہے تو وہ جس ہستی کو پکارتا ہے اُس کا ذاتی نام نہیں بلکہ معبود کے لیے ایک تصوراتی استعارہ ہے۔ نظم کے درمیانی حصہ میں جب بچہ 'یارب' پکارتا ہے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اب اُس کو پہلے سے زیادہ شعور حاصل ہوتا ہے اور وہ اُس ہستی کو جسے وہ معبود سمجھتا ہے اب اپنے مالک اور آقا کے روپ میں دیکھتا ہے اور نظم کے اختتام پر وہ اپنے معبود کو جس نام یعنی 'مرے اللہ' کہہ کر پکارتا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اب اُس معبود کے نام سے آگاہ ہو چکا ہے جسے اُس نے شروع میں 'خدایا' اور نصف میں 'یا رب' کہہ کر پکارا تھا اس لیے وہ اُس ہستی کے ذاتی نام سے بہرہ ور ہو جاتا ہے۔ وہ ہستی خالقِ کائنات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نام کی معرفت حاصل کرنے کے لئے بچہ اپنے شعور کے اعتبار سے اُسے پہلے پہل دوسرے ناموں سے پکارتا رہا اور جب اُس ہستی کے ذاتی نام کا ادراک اُسے ہوا تو اُس نے خالق کو 'مرے اللہ' کہہ کر پکارا جس سے پتہ چلتا ہے کہ خودی کے مختلف مراحل ہیں اور جیسے جیسے یہ پختہ ہوتی ہے تو منزل پا لیتی ہے۔

نانا ابو نے راشد کو مزید بتایا کہ قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک واقعہ کچھ اس انداز سے آیا ہے کہ جب انھوں نے روشن ستارہ دیکھا تو اس کی طرف اشارہ کر کے دریافت کیا: کیا یہ میرا رب ہو سکتا ہے جس کی پرستش میری قوم کر رہی ہے لیکن جب کچھ دیر بعد وہ ستارہ ڈوب گیا جو اس بات کی ایک واضح دلیل تھی کہ یہ رب نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جب چاند کی طرف اشارہ کر کے وہی سوال دہرایا۔ جب صبح کے نزدیک چاند بھی چھپ گیا تو یہ بھی اُس کے رب نہ ہونے کی ایک واضح دلیل تھی۔ اس کے بعد جب سورج طلوع ہوا اور اپنی پوری آب و تاب سے روشنی بکھیرنے کے بعد شام کو غروب ہوا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میری قوم کا یہ بڑا خدا بھی اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہ سکا لہٰذا یہ میرا رب

کیسے ہو سکتا ہے؟ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ اشیاء ڈوبتی اور ابھرتی نظر آئیں تو انھوں نے اصل الاصول کی طرف راہ پالی کہ خالق ان چیزوں جیسا نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ان میں سے کسی سے اُس کو نسبت ہو سکتی ہے۔ رب تو وہ ہے جس کو زوال نہیں۔ اقبال اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی ہے چشمِ جہاں بینِ خلیل

مذکورہ بالا اس واقعے کو اگر دیکھا جائے اور 'بچے کی دُعا' میں اللہ کی ذات تک پہنچنے کے مراحل پر غور کیا جائے تو کچھ باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔ یعنی جب بچہ یہ دعا مانگتا ہے کہ 'زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری' تو وہ یہ تمنا کرتا ہے کہ اُس کی زندگی شمع کی صورت ہو۔ اگلے شعر میں بچہ کہتا ہے کہ اُس کے دم سے دنیا کا اندھیرا دُور ہو جائے اور اُس کے چمکنے سے ہر جگہ اجالا ہو جائے۔ جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ جس شمع کی صورت اختیار کرنا چاہتا ہے وہ تو محض ایک شے کا نام ہے جبکہ اُس کا اصل مقصد روشنی بن جانا ہے تاکہ وہ بھٹکے ہوئے لوگوں کی صراطِ مستقیم پر راہنمائی کر سکے۔ لیکن روشنی بھی اُسے دکھائی دیتی ہے جس کے پاس آنکھیں ہوں۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کی ذات کو پہچانا تھا۔ حتیٰ کہ ستارے، چاند اور سورج تو روز ہی آتے جاتے تھے لیکن باقی لوگ اُس پہلو سے رب کو پہچان نا سکے جیسے انھوں نے پہچانا۔

نانا ابو نے راشد کو مزید بتایا کہ جب نظم کے اختتام پر بچہ دُعا مانگتا ہے کہ اے اللہ مجھے برائی سے بچانا اور نیک راستے پر چلانا۔ یہی پوری دعا کا خلاصہ بھی ہے یعنی کہ ہر طرح کی برائی سے بچنا اور نیک عمل کرنا۔ سورہ فاتحہ کی آخری آیت کے مفہوم پر غور کیا جائے تو اُس میں بھی یہی دُعا ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے ذریعے اُمتِ محمدی کو سکھائی کہ "ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ اُن لوگوں کا راستہ جن پر تیرا انعام ہوا نہ کہ اُن لوگوں کا جن پر تیرا غضب ہوا"۔

راشد نے کہا کہ نانا ابو یہ نظم تو ہم سکول میں بھی پڑھتے ہیں لیکن آج مجھے اِس نظم کے معنی کے بارے میں معلوم ہوا ہے۔ اب جب میں اِس نظم کو یاد کروں گا تو مجھے آپ کی یہ

ساری باتیں یاد رہیں گی۔ نانا ابو مسکراتے ہوئے بولے کہ بیٹا اصل چیز بھی یہی ہے کہ شاعر مشرق نے اپنی شاعری کے ذریعے ہم تک جو پیغام پہنچایا ہے ہم اُسے سمجھیں اور اُس پر عمل کریں۔ نانا ابو نے راشد کو بتایا کہ بیٹا میں تمھیں یہ نظم اِن باتوں کے بغیر بھی یاد کرا سکتا تھا لیکن نظم کے معنی سمجھانا ضروری تھا۔ اب جب تم اِس نظم کو یاد کرو گے تو نہ صرف یہ نظم جلدی یاد ہو جائے گی بلکہ اب تم اس نظم کے معنی اپنے دوستوں اور ہم جماعتوں میں بیان بھی کر سکتے ہو۔ راشد نے اپنے نانا ابو کا شکریہ ادا کیا اور خوشی خوشی وہ اس نظم کے اشعار گنگنانے لگا۔

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز

رات کی تاریکی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سارا شہر گھپ اندھیرے میں ڈوبا پڑا تھا۔ شب کا پچھلا پہر اور سناٹا، ایسے میں ایک بچہ ٹیبل لیمپ کی مدھم سی روشنی میں سر جھکائے مطالعے میں مصروف ہے۔ اسی اثنا میں اُس کی والدہ کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ کیا دیکھتی ہیں کہ اُن کا بیٹا پڑھائی میں مشغول ہے۔ وہ اُس کے پاس آتی ہیں اور کہتی ہیں کہ بیٹا سو جاؤ۔ لڑکا نہایت ادب سے اپنی ماں سے مخاطب ہوتا ہے کہ مجھے ابھی مزید پڑھنا ہے۔

ماں: رات بہت ہو چکی ہے، باقی پڑھائی صبح کر لینا۔

لڑکا: ہاں جانتا ہوں امی جان۔ لیکن اگر میں بھی باقی لوگوں کی طرح سو گیا تو پھر بڑا آدمی کیسے بنوں گا۔

یہ واقعہ کمرۂ جماعت میں اُستاد صاحب سنا رہے تھے اور تمام بچے انتہائی دلچسپی اور انہماک سے سن رہے تھے کہ اُستاد صاحب نے بچوں کو بتایا۔

آپ سب بچے جانتے ہیں کہ یہ لڑکا کون تھا؟ کچھ دیر کے توقف کے بعد اُستاد صاحب نے بتایا کہ یہ ہمارے پیارے وطن پاکستان کے بانی محمد علی جناح تھے جنھوں نے اپنی انتھک محنت سے ایسا مقام حاصل کیا کہ آج تاریخ اُن کو قائداعظم کے نام سے جانتی ہے۔

اُستاد صاحب نے مزید بتایا کہ ۲۵ دسمبر کو قائداعظم کا یومِ پیدائش ہے اس لیے آپ سب بچوں کو چاہیے کہ ان کی شخصیت کا مطالعہ کریں کیونکہ اُن کی شخصیت ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اُستاد صاحب نے جس انداز سے قائداعظم کی باتیں بچوں کو بتائیں، بچوں میں قائداعظم کی شخصیت کے بارے میں مزید جاننے کی لگن پیدا ہوئی۔ واجد علی جب سکول سے گھر آیا تو اُس نے ٹھان لیا کہ آج وہ قائداعظم کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور پڑھے گا اور اگلے روز سکول میں سب کو بھی بتائے گا۔

شام کو جب وہ سکول کے کام اور دوسری مصروفیات سے فارغ ہوا تو اُس نے اپنی الماری میں سے چند کتابیں نکالیں، یہ کتابیں اُس کے ابو نے اُسے مختلف مواقع پر تحائف کی صورت میں دی ہوئیں تھیں۔ اُن کتب میں اُسے قائداعظم محمد علی جناح سے متعلقہ ایک کتاب مل گئی۔ اُس نے کتاب کو اپنی میز پر رکھا اور جیسا واقعہ آج وہ سکول سے سن کر آیا تھا ویسا ہی اُس نے کیا۔ کمرے کی بتی کو بجھایا اور صرف میز پر ہلکی سی روشنی کر کے کتاب کے مطالعے میں مشغول ہو گیا۔

کچھ دیر مطالعہ کرنے کے بعد وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا اور پھر سو گیا۔ اگلے روز جب سکول پہنچا تو اُس کے ذہن میں بہت سی باتیں جمع ہو چکی تھیں جنھیں وہ اپنے اُستاد صاحب سے کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے اُستادِ محترم کو بتایا کہ اُس نے قائداعظم محمد علی جناح کی زندگی کے متعلق کچھ باتیں پڑھی ہیں۔ اُستاد صاحب اُس کی یہ بات سن کر بہت خوش ہوئے اور پھر ساری جماعت سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے:

پیارے بچو! آج ہم جس آزاد اسلامی ریاست میں رہ رہے ہیں وہ قائداعظم اور اُن کے ساتھیوں کی مرہونِ منت ہے۔ پاکستان کا خواب علامہ محمد اقبال نے دیکھا جس قائداعظم نے حقیقت کا رُوپ دیا۔ آپ نے آزاد اسلامی ملک کے حصول کے لیے انتھک محنت کی۔ آپ نے اپنی قوم کے مستقبل کے لیے اپنی بیماری کو بھی پسِ پُشت ڈال دیا اور شبانہ روز کی مسلسل جدوجہد سے بالآخر آپ اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہو گئے اور ۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب پاکستان ایک آزاد اسلامی ملک کے طور پر معرضِ وجود میں آیا۔

اُستاد صاحب کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئے تو واجد علی نے کہا کہ قائداعظم ہمیشہ سچ بولتے تھے اور انھوں نے کہا تھا کہ میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ اسلامی ملک ضرور حاصل کروں گا۔

اُستاد صاحب نے کہا کہ ہاں بھئی! اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ قائداعظم ایک سچے رہنما تھے جنھوں نے ایمانداری اور سچائی جیسے اُصولوں کو اپنایا۔ آپ محنتی اور اپنے اُصولوں کے بہت پکے تھے۔ آپ کی یہ خوبیاں ایسی ہیں کہ اگر آج ہم بھی ان پر عمل کریں تو ہم بھی

ایک اچھے انسان اور سچے مسلمان بن سکتے ہیں۔ قائداعظم نے ہمیں تین رہنما اُصول بتائے ہیں:

۱) ایمان ۲) اتحاد ۳) نظم

اُستاد صاحب نے مزید بتایا کہ زندگی گزارنے کے یہ تین اُصول ایسے ہیں کہ جن پر عمل کر کے ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر ایک اچھے مسلمان، اچھا انسان اور ایک اچھی قوم بن سکتے ہیں۔

واجد علی نے اُستاد صاحب سے سوال کیا کہ ہم ان اصولوں کو کیسے اپنا سکتے ہیں؟

اُستاد صاحب نے کہا کہ میں اس سوال کے جواب میں آپ کو قائداعظم محمد علی جناح کی ایک تقریر کا اقتباس پیش کرتا ہوں جو اُنھوں نے ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو لکھنؤ میں مسلم لیگ کے اجلاس میں فرمایا:

خدا ان کی مدد کرتا ہے، جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمان اپنی ذات پر اعتماد کریں اور اپنی تقدیر کو خود اپنے ہاتھوں سے بنائیں۔ ایسے مستقل مزاج اور باایمان لوگوں کی ضرورت ہے جو حوصلہ اور عزم رکھتے ہوں، جو اپنے عقائد کی خاطر تن تنہا لڑ سکتے ہوں۔

سب بچوں نے اُستاد صاحب کی بات سن کر تالیاں بجائیں اور وعدہ کیا کہ ہم بھی قائداعظم محمد علی جناح کے بتائے ہوئے اُصولوں پر چلیں گے تاکہ ہم بھی اچھی شہری بن سکیں اور پاکستان کی خدمت کر سکیں۔

دیکھا بچو! کس طرح واجد علی اور اُس کی جماعت کے دوسرے بچوں نے اپنے اُستادِ محترم سے وعدہ کیا ہے کہ وہ قائداعظم محمد علی جناح کے بتائے ہوئے اُصولوں پر عمل کریں گے۔ آپ بھی آج یہ وعدہ کریں کہ آپ ہر میدان میں محنت اور سچائی سے کام کریں گے۔ تاکہ آپ نہ صرف ایک اچھے انسان بن سکیں بلکہ ایک اچھا شہری بن کر پاکستان کی بھی خدمت کر سکیں۔

قائداعظم زندہ باد

پاکستان پائندہ باد

صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

اسلامی دُنیا کی تاریخ میں ایسی بہت سی شخصیات ہیں جنھوں نے اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ دے دیا۔ تاریخ میں ایسی ہستیوں کا نام ہمیشہ جگمگاتا رہا ہے اور ہمیشہ چمکتا رہے گا۔ اُستادِ محترم کمرۂ جماعت میں اسلامیات کا درس دے رہے تھے۔ اُستاد صاحب نے فرمایا کہ ایسی ہی ایک شخصیت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہے جنھوں نے اسلام کی ایسی خدمت کی کہ اُن کا نام ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جائے گا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے کارناموں اور واقعات سے ہماری تاریخ روشن ہے۔ اُستاد صاحب نے بچوں کو بتایا کہ آپ کا نام عبد اللہ، کنیت ابو بکر اور لقب صدیق تھا۔ آپ مسلمانوں کے پہلے خلیفہ تھے۔ آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے آپ نے ہی اسلام قبول کیا تھا۔ اُستاد صاحب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق بچوں کو بیان فرما رہے تھے اور بچے انتہائی ادب کے ساتھ اُن کی باتوں کو غور سے سن رہے تھے۔ اُستادِ محترم نے مزید فرمایا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی ساری دولت اسلام کی سربلندی کے لیے خرچ کر دی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ممکن مدد کی جب مکہ کے تمام لوگ ہمارے پیارے نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تھے تب بھی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہ چھوڑا۔ بلکہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا، اُن پر کفار کی طرف سے سختیاں کی جاتیں اور اُن پر ظلم کیا جاتا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایسے میں بہت سے لوگوں کو کفار سے خرید کر آزاد کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کیا۔ حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو بھی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہی آزاد کرایا تھا۔ اُستادِ محترم نے بچوں کو مزید بتایا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت محبت تھی اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی آپ رضی اللہ عنہ سے بے حد محبت کرتے تھے۔

پیارے بچو! آپ کو معلوم ہو گا کہ جب مکہ کے لوگوں نے ہمارے نبی اکرم ﷺ پر زندگی تنگ کر دی تو آپ ﷺ نے مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت فرمائی۔ اُس ہجرت میں آپ ﷺ کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شخصیت ہی تھی۔ دونوں ہستیاں رات کے اندھیرے میں مکہ سے نکلیں۔ پیارے بچو! جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ مکہ کے لوگ ہمارے نبی کریم ﷺ کی جان کے دشمن تھے اس لیے آپ ﷺ نے رات کا سفر کرنا مناسب سمجھا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ساتھ لیا۔ مشکل وقت میں دوست کو ہی ساتھ ملایا جاتا ہے۔ اس واقعہ سے ان دونوں ہستیوں کے درمیان مضبوط دوستی بھی ثابت ہوتی ہے۔ پیارے بچو! جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے کہ ہمارے نبی ﷺ صادق اور امین بھی کہلاتے تھے کیونکہ آپ ﷺ نے ہمیشہ سچ بولا تھا اور اور آپ ﷺ کے پاس لوگ اپنی اشیا کو امانت کے طور پر رکھواتے تھے۔ جب آپ ﷺ نے ہجرت کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے اپنے پاس امانتوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے کیا اور اُن سے کہا کہ وہ سب کی امانتیں لوٹا دیں۔ مکہ سے مدینہ جاتے ہوئے دونوں ہستیوں نے غارِ ثور میں تین دن اور تین راتیں قیام کیا۔ باہر کفار کا سخت پہرہ تھا، وہ آپ ﷺ کی جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ کیونکہ کفار نہیں چاہتے تھے کہ نبی کریم ﷺ کسی بھی طرح سے مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے جائیں۔ ایسے موقع پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہمارے نبی کریم ﷺ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مدینہ پہنچنے کے بعد کفار سے لڑائیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے پہل تو کچھ چھوٹی لڑائیاں لڑی گئیں لیکن بعد میں بڑی لڑائیاں ہوئیں، جن میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ شامل ہوئے اُن میں بدر، اُحد، خندق، خیبر، حدیبیہ، حنین، موتہ، فتح مکہ اور تبوک شامل ہیں۔ جنگ تبوک میں جب آنحضرت ﷺ نے جہاد کی تیاری کے لیے مسلمانوں میں اعلان کیا تو ہر صحابی کی کوشش تھی کہ وہ اس کارِ خیر میں بھر چڑھ کر حصہ لے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے گھر کا آدھا سامان لے آئے جبکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کا سارا سامان اللہ کی راہ میں پیش کر دیا۔

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

نبی اکرم ﷺ جب بیمار ہوئے تو آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امامت کے لیے کہا۔ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کا پہلا خلیفہ چنا گیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا پیشہ تجارت تھا اور خلافت ملنے کے بعد بھی آپ رضی اللہ عنہ نے اِسی پیشے کو جاری رکھا۔ لیکن خلافت کے کاموں کی وجہ سے جب کاروبار کرنا ممکن نہ رہا تو صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین نے اُن کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دل میں انسانوں سے ہمدردی بھری ہوئی تھی۔ بیواؤں، مساکین اور یتیموں کی خبر گیری کرتے تھے۔ بیماروں کی تیمارداری کرتے۔ آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد جن فتنوں نے سر اُٹھایا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اُن کا خاتمہ کیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ۲۲ جمادی الثانی کو وفات پائی۔ آپ رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پڑھائی اور آپ رضی اللہ عنہ کی تدفین نبی اکرم ﷺ کی قبر مبارک کے ساتھ ہوئی۔

اُستادِ محترم نے بچوں کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حیاتِ مبارکہ کے بارے میں بتایا تو بچوں نے انتہائی دلچسپی کے ساتھ ساری باتیں سنیں۔ اُستاد صاحب نے بچوں سے کہا کہ ہمارے لیے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ذات مشعلِ راہ ہے۔ جس طرح آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی اسلام کے لیے وقف کر دی تھی ہمیں بھی چاہیے کہ ہم بھی اللہ کے دین کی خدمت اُسی جذبہ کے تحت کریں۔